ملک صفدر حیات (سیریز نمبر 13)
دست نسواں
(تحریر حسام بٹ)
عقیل قریشی - یاسر حسین
ناصر بلوچ - صائم بھائی
محمد سجاد بھٹی
سسپنس ڈائجسٹ : دسمبر 2002

دستِ نسواں

ملک صفدر حیات

رشتہ اور رشتہ داریوں کی اہمیت مسلمہ ہے مگر کچھ لوگ رشتوں کو انا کا مسئلہ بنالیتے ہیں۔ ایسی انانیت اکثر و بیشتر بڑے حادثات کو جنم دیتی ہے مگر انانیت کے شکار اس میں بھی اپنی بڑائی کا کوئی پہلو دریافت کرلیتے ہیں۔ وہ بڑائی اُن کے لئے بڑائی ہوتی ہے مگر دراصل وہ بہت بڑی برائی ہوتی ہے۔ ملک صاحب کی ڈائری سے منتخب کردہ رشتوں کی پیچیدگیوں کے باعث رونما ہونے والے ایک سچے واقعے کا فسانہ۔

ہمارے اردگرد بکھرے مختلف اچھے برے لوگوں میں سے چند کا احوال

چوری کی رپورٹ منچن آباد کے ایک تھانے میں درج کروائی گئی تھی۔ تاہم تفتیشی افسر اے ایس آئی فیروز تفتیش کرتے ہوئے میرے پاس پہنچ گیا تھا۔ وہ رات کا وقت تھا اور میں تھانے سے اٹھنے کی تیاری کررہا تھا۔

ان دنوں میں ضلع بہاول نگر کے ایک قصبے "لالیکا" سے متعلقہ تھانے میں تعینات تھا۔ مذکورہ قصبہ دریائے ستلج کے کنارے واقع ہے۔ دریا کی دوسری جانب ضلع پاک پتن کا علاقہ شروع ہوجاتا ہے۔ دریائے ستلج کا جو حصہ پڑوسی ملک بھارت میں ہے 'وہ "بیاس" یعنی دریائے بیاس کہلاتا ہے۔

میں نے خوش دلی سے اے ایس آئی فیروز کا استقبال کیا۔ فیروز صحت مند جسم کا مالک ایک دیہاتی ٹائپ پولیس والا تھا۔ اس کی عمر کا اندازہ میں نے پینتیس اور چالیس کے درمیان لگایا۔ اس کے ساتھ دو افراد اور بھی تھے۔ تعارف پر معلوم ہوا کہ ان میں ایک کانسٹیبل اللہ دتا اور دوسرا کھوجی چراغ دین تھا۔ وہ تینوں سادہ لباس میں تھے۔

رسمی علیک سلیک کے بعد میں نے فیروز سے اس کی آمد کی غرض وغایت دریافت کی تو مجھے معلوم ہوا کہ وہ ایک مویشی چور محمد بوٹا المعروف بہ "بوٹا ڈنگر چور" کے قدموں کا تعاقب کرتے ہوئے یہاں تک پہنچے تھے۔

اے ایس آئی نے کہا "ملک صاحب! بوٹا ڈنگر چور بہت چالاک اور ہوشیار وارداتیا ہے۔ ہم نے اس کا کھرا نکالا ہے۔ وہ منچن آباد سے سیدھا آپ کے علاقے میں پہنچا ہے مگر اس سے آگے کا کوئی سراغ نہیں مل رہا۔"

"پھر!" میں نے سوالیہ نظر سے اسے دیکھا۔

وہ تامل کرتے ہوئے بولا "پھر جناب یہ کہ ..... ہماری تفتیش سے یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ وہ ابھی تک آپ ہی کے علاقے میں کہیں روپوش ہے۔"

میں نے پوچھا "کیا تم لوگوں نے اس بات کی تسلی کرلی ہے کہ وہ میرے تھانے کی حدود سے باہر نہیں گیا؟"

اس نے اثبات میں سرہلایا اور بولا "جی ملک صاحب! کھوجی چراغ دین کا ماہرانہ تجزیہ یہی ہے کہ وہ لالیکا سے باہر نہیں گیا۔"

اے ایس آئی شروع میں مجھے بتاچکا تھا کہ اسے جس مویشی چور کی تلاش ہے وہ منچن آباد سے سات بھینسیں چرا کر فرار ہوا تھا۔ میں نے اس سے سوال کیا "فیروز! کیا یہ سات کی سات بھینسیں کسی ایک ہی شخص کی ملکیت تھیں؟"

اس نے نفی میں گردن ہلائی اور جواب دیا "ملک صاحب! بوٹا نے دو مختلف افراد کے باڑوں سے بھینسیں چرائی ہیں۔ موضع علی پور کے زمیں دار خدا بخش کی چار بھینسیں اور موضع خالص خورد کے کاشتکار غلام رسول کی تین بھینسیں۔ کل ملا کر سات بھینسیں ملک صاحب!"

میں نے کہا "موضع علی پور اور موضع خالص خورد منچن آباد ہی کے علاقے ہیں مگر پھر بھی دو مختلف جگہوں سے بھینسیں چرا کر یہاں لالیکا تک لانا کوئی آسان کام نہیں ہے۔"

"کام تو واقعی بہت مشکل ہے سرکار!" کھوجی چراغ دین نے گردن ہلاتے ہوئے کہا "لیکن یہ جو بوٹا ڈنگر چور ہے نا' یہ بھی بڑا کانٹے کا چور ہے۔ بڑے بڑے کارنامے ہیں اس کے ریکارڈ پر۔"

اس کے بعد اے ایس آئی بوٹا کے بارے میں تفصیلات بتانے لگا جس میں اس کی چوری کی وارداتوں کی دلچسپ اور کٹھن داستان کے علاوہ اس کا قد کاٹھ اور حلیہ وغیرہ بھی شامل تھا۔ بوٹا کا قد ساڑھے چھ فٹ سے نکلتا ہوا تھا۔ وہ ہاتھ پاؤں کا مضبوط ایک گرانڈیل شخص تھا۔ اے ایس آئی کی تحقیق سے پتا چلا کہ بوٹا موضع "امروکا" کا رہنے والا تھا۔

میں نے کہا "اے ایس آئی جی! تم نے کبھی بوٹا کی تلاش

میں امروکا کا بھی کوئی چکر لگایا کہ نہیں؟"

"کوئی فائدہ نہیں ہوا جناب!" فیروز نے بددلی سے جواب دیا "میں کئی مرتبہ امروکا جا چکا ہوں' بوٹا کی تلاش میں مگر وہاں ایک مرتبہ بھی اس سے ملاقات نہیں ہو سکی۔ وہاں رہنے والوں کا کہنا ہے کہ وہ کبھی کبھار ہی اپنے گاؤں کا پھیرا لگاتا ہے۔"

ہمارے درمیان کچھ دیر تک بوٹا ڈنگر چور (ڈنگر بہ معنی مویشی) کے بارے میں گفتگو ہوتی رہی پھر میں نے اے ایس آئی فیروز سے پوچھا۔

"تم مجھ سے کیا چاہتے ہو؟"

"بوٹا کی تلاش میں آپ کی مدد درکار ہے جناب!"

میں نے کہا "میں تمہارے ساتھ پورا تعاون کروں گا۔"

وہ خوش ہو گیا اور ممنونیت آمیز نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔

میں نے ایک کانسٹیبل کو اپنے پاس بلایا اور اسے ہدایات جاری کرنے لگا۔ "نجیب اللہ! اے ایس آئی صاحب اور ان کے ساتھیوں کے لیے کھانے پینے اور بستر کا بندوبست کرو۔ یہ ہمارے مہمان ہیں۔"

"اوکے سر!" کانسٹیبل نے نہایت فرمانبرداری سے کہا اور میرے کمرے سے نکل گیا۔

میں نے اے ایس آئی فیروز سے کہا "تم لوگ کھاؤ پیو اور آرام کرو۔ اب صبح ہی ہماری ملاقات ہوگی۔"

اس کے بعد میں تھانے سے ملحق اپنے سرکاری کوارٹر میں آ گیا۔

دوسری صبح میں تھانے پہنچا تو پتا چلا کہ منچن آباد والے سرکاری مہمان رخصت ہو چکے تھے۔ مجھے اس پر سخت حیرت ہوئی اور میں نے شبینہ ڈیوٹی والے اے ایس آئی کو اپنے پاس بلا لیا اور اس سلسلے میں اس سے استفسار کیا۔

اے ایس آئی نے بتایا "ملک صاحب! وہ تینوں تو صبح ہوتے ہی نکل گئے تھے۔ میں نے فیروز سے اس قدر عجلت میں رخصت ہونے کی وجہ پوچھی تو اس نے بتایا کہ انہیں بوٹا کا ایک سراغ ملا ہے اور وہ اسی کو چھاپنے جا رہے ہیں۔"

"انہیں مویشی چور بوٹا کا ایسا کون سا سراغ ملا تھا کہ انہوں نے میرا بھی انتظار نہیں کیا" میں نے کہا "کم از کم میرے تھانے پہنچنے تک تو رک جاتے!"

اے ایس آئی نے بتایا "ملک صاحب! میں نے فیروز سے کہا تھا کہ آپ کو مطلع کر دیا جائے۔ جواب میں اس نے کہا کہ جب آپ تھانے آئیں تو آپ کو بتایا جائے۔ ویسے بھی وہ واپس آنے کا کہہ کر گئے ہیں۔"

"وہ کہاں گئے ہیں؟" میں نے پوچھا "تم بوٹا کے بارے میں کسی سراغ کا ذکر کر رہے تھے؟"

اے ایس آئی نے اثبات میں سر ہلایا اور جواب دیا "مجھے فیروز نے جو کچھ بتایا ہے' اس کے مطابق کھوجی بابا چراغ دین علی الصباح اٹھنے کا عادی ہے۔ وہ حوائج ضروریہ کے لیے کھیتوں کی جانب نکل گیا تھا۔ واپس آ کر اس نے بتایا کہ بوٹا کے قدموں کے نشانات دریا کی طرف جانے والے راستے پر پائے گئے ہیں۔ یہ خبر سنتے ہی اے ایس آئی فیروز اٹین شن ہو گیا۔ اس نے کانسٹیبل اللہ دتا کو بھی جگا دیا اور وہ تینوں ناشتا کیے بغیر تھانے سے نکل گئے ہیں۔ جاتے ہوئے فیروز نے کہا تھا کہ اب وہ کوئی خوش خبری لے کر ہی واپس آئیں گے۔"

"ہوں" میں نے پرسوچ انداز میں گردن ہلائی پھر پوچھا "انہیں رات میں کھانے پکانے اور آرام کرنے کے حوالے سے کسی قسم کی کوئی تکلیف تو نہیں ہوئی؟"

اے ایس آئی نے پروثوق انداز میں جواب دیا "ہم نے پوری طرح ان کا خیال رکھا تھا ملک صاحب!"

"شاباش" میں نے اس کی کارکردگی کو سراہتے ہوئے کہا "محکمہ جاتی مسائل سے دوچار مہمانوں کا خیال رکھنا ہماری ڈیوٹی کا حصہ ہے۔ میری دعا ہے کہ فیروز کو بوٹا کے بارے میں کوئی مفید اور حوصلہ افزا صورتِ حال ہی سے واسطہ پڑے۔ بے چارہ پہلے ہی بڑی دربہ دری کے بعد یہاں پہنچا تھا۔"

اے ایس آئی نے کہا "ملک صاحب! امید تو یہی ہے کہ فیروز کو کامیابی ہوگی۔"

"اللہ کرے' ایسا ہی ہو" میں نے خلوص دل سے کہا۔

تھوڑی دیر بعد اے ایس آئی میرے کمرے سے رخصت ہو گیا۔ میں روز مرہ کی مصروفیات میں مشغول ہو گیا۔ مجھے ضروری کام نمٹاتے ہوئے زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی کہ کانسٹیبل شاہد علی نے میرے پاس آ کر بتایا "ملک صاحب! چاچا کرمو فوری طور پر آپ سے ملنا چاہتا ہے۔"

"یہ چاچا کرمو کون ہے؟" میں نے پوچھا "اور مجھ سے فوراً ملنے کی وجہ کیا ہے؟"

کانسٹیبل نے میرے سوالات کا جواب دیتے ہوئے بتایا "کرمو کا اصل نام تو کرم دین ہے ملک صاحب! وہ یہیں لالیکا ہی کا رہنے والا ہے۔ وہ آپ سے اس لیے ملنا چاہتا ہے کہ گزشتہ رات اس کے گھر میں چوری ہو گئی ہے۔"

"چوری!" بے ساختہ میرے منہ سے نکلا۔

"جی ہاں" کانسٹیبل نے بتایا "چور چاچا کرمو کا جمع جتھا

سب لے کر چلے گئے۔ بے چارہ بہت پریشان ہے۔ اس کے تو آنسو نہیں رک رہے۔ میں نے اسے برآمدے میں بینچ پر بٹھا رکھا ہے۔"

کانسٹیبل کی وضاحت کے دوران میں میرا ذہن "چور اور چوری" کے الفاظ اور ان الفاظ کے مفہوم میں الجھا رہا۔ گزشتہ رات اور ابھی تھوڑی دیر پہلے تک مویشی چور بوٹا کا ذکر ہوتا رہا تھا اور اب .... کرمو چاچا کے گھر میں چوری کا تذکرہ ہو رہا تھا۔ اس وقت میرا دماغ بہت تیز رفتاری سے کام کر رہا تھا۔

میں نے کانسٹیبل سے کہا "فریادی کو اندر بھیجو۔"

"جی.... کس کو اندر بھیجوں ملک صاحب!"

"فریادی کو" میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا "وہ شخص جو باہر برآمدے میں بیٹھا ہے۔"

"اوکے سر! میں سمجھ گیا" کانسٹیبل نے سلیوٹ مارتے ہوئے کہا "میں کرمو چاچا کو ابھی آپ کے پاس بھیجتا ہوں۔"

چند لمحات کے بعد کرم دین سراپا فریاد میرے سامنے موجود تھا۔ میں نے اس کی خستہ حالت کو دیکھتے ہوئے اسے کرسی پر بیٹھنے کو کہا۔ تھوڑی سی ہچکچاہٹ کے بعد وہ بیٹھ گیا۔

کرم دین عرف چاچا کرمو تہ بند اور کرتے میں ملبوس تھا۔ رنگت گندمی اور ہاتھ پاؤں مضبوط۔ اس کی عمر کا اندازہ میں نے پینتالیس اور پچاس کے درمیان لگایا جو ازاں بعد درست ثابت ہوا۔ وہ لگ بھگ سینتالیس سال کا تھا۔

میں نے اس کے چہرے پر نگاہ جماتے ہوئے سوال کیا "کرم دین! سنا ہے، تمہارے گھر میں چوری ہوگئی ہے؟ کیا کچھ گیا ہے؟"

"ککھ (تنکا) نہیں رہا جناب!" وہ گلوگیر آواز میں بولا "ظالم میری زندگی بھر کی کمائی لے گئے ہیں۔"

میں نے ہمدردانہ لہجے میں کہا "ذرا تفصیل سے بتاؤ۔"

میرے پُرخلوص انداز نے اسے حوصلہ دیا اور وہ پھٹ پڑا۔ اس نے آنسو بہاتے ہوئے مجھے اپنی بپتا سنائی جس کے مطابق گزشتہ رات کسی وقت اس کے گھر میں چوری ہوگئی تھی۔ اسے اس اندوہناک واقعے کے بارے میں صبح ہی خبر ہوئی تھی۔ وہ منہ اندھیرے اٹھنے کا عادی تھا۔ وہ جون کا مہینا تھا اور ان دنوں بڑی قیامت خیز گرمی پڑ رہی تھی۔ دن میں آسمان آگ برساتا تھا تو رات بھی ایذا رسانی کے تمام آلات کے ساتھ جلوہ افروز ہوتی تھی۔ حبس اس بلا کا ہوتا تھا کہ لوگوں کو مکانوں کی چھتوں پر سونا پڑتا تھا یا پھر جن لوگوں کے صحن کشادہ تھے، وہ وہاں چارپائیاں بچھا لیتے تھے۔ کرم دین کے گھر کا صحن بہت چھوٹا تھا لہٰذا وہ اپنی بیوی اور بیٹی کے ساتھ مکان کی چھت پر سوتا تھا۔ صبح سے پہلے جب وہ اٹھ کر نیچے آیا تو اس نے گھر کا بیرونی دروازہ کھلا پایا۔ اس کا ماتھا ٹھنکا۔ اسے اچھی طرح یاد تھا کہ رات کو چھت پر جانے سے پہلے اس نے نہ صرف یہ کہ دروازہ بند کرکے کنڈی لگائی تھی بلکہ باقاعدہ تالا بھی لگایا تھا۔

کھلے ہوئے دروازے کو دیکھ کر کرم دین کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ وہ تشویش ناک انداز میں مکان کے کمروں کی جانب بڑھا۔ دو میں سے ایک کمرے کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ یہ بہت خاص کمرا تھا۔ اسی کمرے میں کرم دین کی زندگی بھر کی کمائی محفوظ کی گئی تھی۔ وہ لرزتے قدموں کے ساتھ کمرے کے اندر داخل ہوا۔ طاق میں رکھے چراغ کو جلا کر اس نے کمرے کی تاریکی کو حتی الامکان کم کردیا پھر کمرے کے اس گوشے کو تلاشا جہاں جمع پونجی کو چھپا کر رکھا گیا تھا۔ اب وہاں کچھ بھی نہیں تھا۔ کرم دین کی متاعِ حیات چور لے کر جا چکے تھے۔

میں نے اس کے بیان کے وقفے میں پوچھا "کرم دین! تمہارا جو نقصان ہوا ہے اس کے بارے میں بتاؤ گے؟"

"ضرور بتاؤں گا سرکار!" وہ رندھی ہوئی آواز میں بولا۔ "میرا سب کچھ ایک جستی ٹرنک میں محفوظ کیا گیا تھا۔ میں نے خود محفوظ کیا تھا۔ وہ میری زندگی بھر کی کمائی تھی جو میں نے ایک خاص مقصد کے تحت محفوظ کی تھی۔"

پھر اس نے اپنے خاص مقصد کی وضاحت کرتے ہوئے بتایا کہ وہ اپنی اکلوتی بیٹی نگہت پروین عرف نگو کی شادی بڑی شان اور دھوم دھام سے کرنا چاہتا تھا۔ وہ اپنی بچت سے رفتہ رفتہ نگو کا جہیز جمع کر رہا تھا اور تمام چیزیں اس نے جستی ٹرنک میں رکھی ہوئی تھیں۔

میں نے پوچھا "کرم دین! نگو کے جہیز کے لیے تم نے جو سامان جمع کیا تھا اس کی تفصیل کیا ہے؟"

کرم دین نے جواب دیا "تھانے دار صاحب! میں نے داج (جہیز) کے سلسلے میں صرف قیمتی چیزیں ہی خریدی تھیں جو ٹرنک میں بہ آسانی رکھی جا سکتی تھیں۔ فرنیچر اور دیگر بڑے سامان کے لیے میں نے نقد رقم محفوظ کرلی تھی۔ یہ تمام چیزیں میں شادی سے چند روز قبل خریدنا چاہتا تھا۔"

"تم نے میرے سوال کا جواب نہیں دیا کرم دین؟" میں نے کہا۔

"میں اسی طرف آرہا ہوں سرکار!" وہ افسوس ناک انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولا "جستی ٹرنک میں پندرہ

تولے کے طلائی زیورات تھے۔ اس کے علاوہ بیس جوڑے کپڑوں کے تھے جن میں دس جوڑے ریشمی اور کام دار تھے جب کہ باقی دس جوڑے سادہ ریشمی عمدہ قسم کے کپڑے سے تیار کیے گئے تھے۔ علاوہ ازیں نقدی بھی اسی ٹرنک میں کپڑوں کی تہ میں رکھی گئی تھی۔"

"نقد رقم کتنی تھی؟" میں نے پوچھا۔

کرم دین نے جواب دیا "پورے پانچ ہزار روپے تھے سرکار!"

میں چونکا۔ اس زمانے میں پانچ ہزار روپے اچھی خاصی رقم تھی۔ پھر پندرہ تولے سونے کے زیورات کی بھی بڑی اہمیت تھی۔ اس پر بیس جوڑے قیمتی کپڑوں کے۔ یہ تو ایک شاندار شادی کی تیاری نظر آتی تھی۔

واضح رہے کہ وہ بہت سستا زمانہ تھا۔ اس وقت سونے کا بھاؤ لگ بھگ اسّی یا نوّے روپے تولہ تھا۔ پانچ روپے کی نہایت اعلیٰ کوالٹی کی ایک من گندم مل جاتی تھی۔ اسی تناظر میں، میں نے کرم دین سے سوال کیا۔

"کرم دین! تمہارا ذریعۂ معاش کیا ہے؟"

اس نے بتایا "میں ایک چھوٹا سا مزارع ہوں تھانے دار صاحب!"

"مزارع تابع مرضی مالک!" میں نے سوالیہ نظر سے اسے دیکھا۔

وہ نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولا "نہیں سرکار! میں "مزارع خود کاشت" قسم کا زمیندار ہوں۔ اللہ کا شکر ہے، اس نے روزگار، عزت اور صحت دے رکھی ہے۔ کاشت کار ہوں، کاشت کاری کرتا ہوں۔ اللہ اللہ خیر سلا۔"

واہ! وہ بھی کیا زمانہ تھا۔ ان پڑھ لوگ بھی محاورے اور بولی ٹھولی سے بہ خوبی آگاہ تھے۔ کرم دین نے کسی مدرسے کا منہ نہیں دیکھا تھا مگر اس نے میرے مبنی بر محاورہ سوال کا جواب بھی بامحاورہ ہی دیا تھا۔ اب تو وہ دور خواب و خیال ہو کر رہ گیا ہے۔

میں نے پوچھا "کرم دین! جب تم نے دیکھا کہ کمرے سے جستی ٹرنک غائب ہے تو پھر تم نے کیا کیا؟"

"میرا تو جناب دماغ ہی گھوم گیا تھا" وہ قدرے ٹھہرے ہوئے لہجے میں گویا ہوا میرے دوستانہ اور ہمدردانہ رویے نے اسے خاصا حوصلہ بخش دیا تھا۔ وہ بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا "تھانے دار صاحب! میں بھاگم بھاگ چھت پر گیا اور جھنجوڑ کر اپنی گھر والی کو جگا دیا۔ زینت ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی۔ میں نے جب اسے صورتِ حال سے آگاہ کیا تو وہ فوراً دوپٹا سنبھالتے ہوئے میرے ساتھ نیچے آئی، پھر جب اس نے کمرے میں جستی ٹرنک کو غیر موجود پایا تو ہائے ہائے کرنے لگی۔ وہ چوروں کو کوس رہی تھی۔ اسی شور غل سے نگو کی آنکھ بھی کھل گئی اور تھوڑی ہی دیر بعد وہ بھی ہمارے پاس پہنچ چکی تھی۔"

"پھر کیا ہوا؟" میں نے سوال کیا۔

کرم دین تھوک نگلتے ہوئے بولا "ہونا کیا تھا جی، ہمارے شور شرابے سے آلے دوالے (آس پاس) کے لوگ بھی ہماری جانب متوجہ ہوگئے۔ اس وقت سپیدۂ سحر نمودار ہو رہا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے میرا گھر لوگوں سے بھر گیا پھر چوروں اور ٹرنک کے بارے میں باتیں ہونے لگیں اور اب میں آپ کے پاس بیٹھا ہوں۔"

کرم دین کی تفصیل اختتام پذیر ہوئی تو میں نے پوچھا "تمہارا جو جستی ٹرنک چوری ہوا ہے اس میں کوئی تالا وغیرہ بھی لگا ہوا تھا؟"

"جی سرکار، بہت مضبوط تالا لگایا تھا میں۔"

میں نے سوال کیا "کیا تمہیں کچھ اندازہ ہے، چوری کس نے کی ہوگی؟"

"نہیں تھانے دار صاحب!" وہ نفی میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔

"کسی سے تمہاری دشمنی ہے؟"

"میں نے تو ہمیشہ لوگوں کو دوست بنانے کی کوشش کی ہے۔"

میں نے پوچھا "یہ بات تمہارے علاوہ اور کون جانتا تھا کہ جستی ٹرنک میں تم نے قیمتی سامان اور طلائی زیورات وغیرہ رکھ چھوڑے تھے؟"

اس نے جواب دیا "یہ بات صرف تین افراد کو معلوم تھی" پھر اس نے وضاحت کی "یعنی میں، میری گھر والی اور نگو۔ ہم تینوں کے علاوہ کوئی نہیں جانتا تھا کہ میں نے نگو کی شادی کے سلسلے میں کیا کچھ جمع کر رکھا تھا۔"

"کیا تمہیں یقین ہے کہ تمہاری بیوی یا بیٹی نے کسی شخص سے جستی ٹرنک کے بارے میں کچھ نہیں کہا ہوگا؟" میں نے کریدنے والے انداز میں کہا۔

وہ مضبوط لہجے میں بولا "میں نے انہیں اس معاملے میں سختی سے زبان بند رکھنے کی تاکید کر رکھی تھی اور مجھے امید ہے، انہوں نے میری تاکید کو ذہن میں رکھا تھا۔ ویسے میں نے اپنی تسلی کے لیے زینت اور نگو سے یہ سوال آج صبح کیا تھا۔ ان دونوں کا ایک ہی بیان ہے، انہوں نے اس سلسلے میں

اپنی زبان بند ہی رکھی تھی۔"
میں نے مزید چند سوالات کے بعد کرم دین کو باہر بیٹھنے کی ہدایت کرتے ہوئے کہا "میں ابھی تمہارے ساتھ چلتا ہوں۔ وقوعہ کا جائزہ لینا بہت ضروری ہے۔ باقی کارروائی اس کے بعد ہوگی۔"
وہ مطمئن انداز میں میرے کمرے سے نکل گیا۔
میں نے ایک کانسٹیبل کو بھیج کر اے ایس آئی کامی شاہ کو اپنے پاس بلالیا۔ کامران محمود عرف کامی شاہ نہایت فرض شناس اور ذمے دار پولیس اہلکار تھا۔ اس کے والد بڑے شاہ صاحب برٹش پولیس میں تھے۔ پاکستان کے قیام کے بعد وہ پاک پولیس میں آگئے۔ اب بڑے شاہ صاحب ریٹائر ہوچکے تھے۔ کامی شاہ کا تعلق منڈی صادق گنج کے علاقے موضع مدھانی والا سے تھا۔
کامی شاہ چند لمحات کے بعد میرے پاس موجود تھا۔ میرے تھانے میں سب سے زیادہ فعال اور جرأت مند نوجوان افراد میں کامی شاہ کا نمبر پہلا تھا۔ میں نے مختصراً کامی شاہ کو کرم دین کے گھر ہونے والی چوری کی واردات سے آگاہ کیا پھر کہا "ہمیں فوراً موقع واردات پر پہنچنا ہے۔"
"ٹھیک ہے ملک صاحب!" وہ پرجوش انداز میں بولا "میں دس پندرہ منٹ میں روانگی کی تیاری کرلیتا ہوں۔"
جب تک کامی شاہ واپس آتا' میں نے اپنے سامنے میز پر پھیلے ہوئے کاغذات کو متعلقہ جگہوں پر رکھا پھر ہم کرم دین کے ہمراہ اس کے گھر کی طرف چل دیے۔
کرم دین عرف کرمو کا گھر ایک عام سا مکان تھا۔ پیچھے دو کمرے تھے۔ کمروں کا ایک ایک دروازہ صحن میں کھلتا تھا جب کہ دونوں کمروں کی درمیانی دیوار میں بھی ایک دروازہ موجود تھا۔ صحن بہت مختصر تھا جس کے ایک کونے میں رسوئی نما باورچی خانہ بھی بنا ہوا تھا۔ باورچی خانے کے دروازے کے باہر چھوٹا سا کھرا بنایا گیا تھا جہاں برتن وغیرہ دھوئے جاتے تھے یا پھر کپڑوں کی دھلائی ہوتی ہوگی۔
میں نے کرم دین کی معیت میں اس کمرے کا تفصیلی جائزہ لیا جس کے اندر جستی ٹرنک رکھا گیا تھا۔ کرم دین نے اس جگہ کی نشاندہی بھی کی جہاں مذکورہ ٹرنک پڑا ہوا تھا۔ کرم دین کی زبانی معلوم ہوا کہ جس کمرے میں ٹرنک موجود تھا' اس کا بیرونی دروازہ ہمیشہ بند رکھا جاتا تھا۔ اس کمرے میں آمدو شد کے لیے وسطی دیوار میں موجود دروازہ استعمال کیا جاتا تھا۔
کمرے کی حالت سے پتا چلتا تھا کہ چور کو جستی ٹرنک تلاش کرنے میں کسی قسم کی دقت کا سامنا نہیں کرنا پڑا تھا۔ کمرے میں موجود ہر شے اپنی مناسب جگہ پر رکھی نظر آرہی تھی۔ اس سے ایک بات واضح ہوکر سامنے آرہی تھی کہ چور جو کوئی بھی تھا (یا تھے) وہ اس قیمتی ٹرنک کی وہاں موجودی اور مقام سے پوری طرح آگاہ تھا ورنہ چوری کی وارداتوں میں جائے وقوعہ پر خاصی افراتفری اور اکھاڑ پچھاڑ دیکھنے میں آتی ہے۔
جائے واردات کا تفصیلی نقشہ تیار کرنے کے بعد میں وہاں موجود لوگوں سے سوال جواب کرنے لگا۔ کافی کوشش کے بعد بھی کوئی ایسی بات یا اشارہ سامنے نہیں آیا جس سے چور یا چوروں کے بارے میں کسی قسم کی رہنمائی حاصل ہوتی۔ پوچھ تاچھ کے سلسلے میں' میں نے کرم دین کی بیوی اور بیٹی سے بھی مختلف سوالات کیے۔ انہوں نے بھی اس سلسلے میں اپنی لاعلمی کا اظہار کیا۔
کرم دین کی بیوی زینت بی بی نے سینہ کوبی کرتے ہوئے کہا "تھانے دار صاحب! ہم تو کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہے۔ دس دن بعد نگو کی برات آنے والی ہے۔ اس کے داج کا سارا سامان تو چور لے گئے۔ اب یہ شادی کیسے ہوگی؟"
"سب ٹھیک ہوجائے گا بھلیے لوگے" کرم دین نے اپنی بیوی کو تسلی دیتے ہوئے کہا "اللہ کوئی نہ کوئی راہ نکال ہی دے گا۔"
وہ ہاتھ نچاتے ہوئے عجیب سے لہجے میں بولی "اللہ تو کوئی نہ کوئی راہ نکال ہی دے گا مگر وہ تمہارا بھائی۔۔" اتنا کہہ کر زینت نے معنی خیز نظر سے شوہر کو دیکھا اور بولی "فضل دین بغیر داج کے میری نگو کی ڈولی لے کر نہیں جائے گا۔"
"تم بدگمانی کی باتیں نہ کرو" کرم دین نے کم زور سا احتجاج کرتے ہوئے کہا "فضل دین میرا بڑا بھائی ہے۔ وہ میری مجبوری کو سمجھنے کی کوشش کرے گا۔"
"اونہہ.... مجبوری!" وہ منہ بگاڑ کر بولی "اگر فضل دین کو ہماری مجبوری کا احساس ہوتا تو پندرہ تولے کی شرط ہی کیوں لگاتا۔ کیا نگو اس کی بھتیجی نہیں ہے؟"
کرم دین نے معتدل لہجے میں کہا "میں پھر بھی کہوں گا کہ تم فضل دین کے بارے میں کسی غلط فہمی کا شکار ہورہی ہو۔ بلکہ یہ تمہاری حاسدانہ سوچ ہے۔"
"میں کیوں حسد کروں گی کسی سے؟"
"یہ بات تم اچھی طرح جانتی ہو" وہ معنی خیز لہجے میں بولا۔

"میں جو کچھ بھی جانتی ہوں، اس میں حسد کی کوئی گنجائش نہیں نکلتی" زینت نے شوہر کو گھور کر دیکھا اور بولی تم خواہ مخواہ مجھ پر الزام لگا رہے ہو۔"

کرم دین نے کہا "اس میں الزام کی کیا بات ہے؟ میں نے تمہارے بھانجے کا رشتہ رد کر کے اپنے بھتیجے سے نگو کی شادی کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ یعنی تمہاری بہن کی بہ نسبت اپنے بھائی کے بیٹے کو ترجیح دی ہے۔ تمہارے حسد کی وجہ سمجھ میں آتی ہے" ایک لمحے کے توقف کے بعد اس نے اضافہ کیا "نگو کا نصیب جہاں لکھا تھا، وہاں اس کی بات پکی ہو گئی۔ تم جلنا کڑھنا چھوڑ دو۔"

"میری جلتی ہے جوتی!" وہ پاؤں پٹختے ہوئے بولی "اور یہ جو تم نے نصیب کی بات کی ہے نا، تو تم منہ دھو رکھو۔ تم نے اپنے بھتیجے سے نگو کی جو بات پکی کی تھی، مجھے تو اب وہ سارا معاملہ ہی خطرے میں نظر آ رہا ہے۔ فضل دین ایک لالچی انسان ہے۔ میں اس کی فطرت سے اچھی طرح واقف ہوں۔"

کرم دین نے بیوی کو آنکھیں دکھاتے ہوئے کہا "تم حد سے بڑھ رہی ہو۔ میرے بھائی کو یوں برا بھلا کہنے کا تمہیں کوئی حق نہیں ہے۔"

اس سے پہلے کہ وہ دونوں آپس میں تلخ و ترش بحث و تکرار شروع کر دیتے، میں نے بیچ بچاؤ کرا دیا تاہم ان کی گفتگو سے مجھے جو معلومات حاصل ہوئیں، اس کی تفصیل کچھ یوں ہے۔

کرم دین کی بیوی زینت بی بی اپنی بیٹی نگو کی شادی اپنے بھانجے نادر علی سے کرنا چاہتی تھی مگر اس رشتے کے لیے کرم دین بالکل تیار نہیں تھا۔ وہ اپنے بھتیجے قادر بخش سے نگو کو بیاہنا چاہتا تھا۔ میاں بیوی کی رسّاکشی میں جیت میاں یعنی کرم دین کی ہوئی تھی اور نگو کی شادی قادر بخش سے ہونا قرار پائی تھی۔ اس سلسلے میں کرم دین کے بڑے بھائی فضل دین نے پندرہ تولے سونے کی زیورات کی شرط بھی لگائی تھی جو کرم دین نے کسی نہ کسی طور پوری کر دی تھی تاہم اس شادی میں صرف دس دن باقی تھے کہ کرم دین کے گھر میں چوری ہو گئی تھی۔ مجھے یہ بھی معلوم ہو گیا تھا کہ نگو کا تایا فضل دین فورٹ عباس کے علاقے چک دو سو چورانوے میں رہتا تھا جبکہ زینت بی بی کی بہن اور بہنوئی ہارون آباد کے علاقے کوٹ خمور سنگھ کے رہنے والے تھے۔

میں لگ بھگ آدھا گھنٹا مزید وہاں رکا۔ اس دوران میں، میں کرم دین سے مختلف سوالات کرتا رہا۔ میں نے خاص طور پر اس کی توجہ اس جانب مبذول کروائی۔

"کرم دین! میں نے جائے وقوعہ کا اچھی طرح جائزہ لیا ہے" میں نے ٹھوس لہجے میں کہا "اور جو بات میں نے نوٹ کی ہے اس سے تم انکار نہیں کر سکتے۔"

"ایسی کیا بات ہے جناب!" وہ حیرت سے میری طرف دیکھنے لگا۔

میں نے کہا "کمرے کی حالت دیکھ کر تمہیں کیا محسوس ہو رہا ہے؟"

وہ تھوڑی دیر تک آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر چاروں جانب دیکھتا رہا پھر شکست خوردہ انداز میں مجھے تکتے ہوئے بولا "میں کچھ نہیں سمجھا تھانے دار صاحب!"

"میں سمجھاتا ہوں" میں نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا "اس کمرے کی حالت سے اندازہ ہوتا ہے کہ چور کو جستی ٹرنک تلاش کرنے کے لیے کسی قسم کی تگ و دو نہیں کرنا پڑی۔ وہ آیا اور بڑے آرام سے ٹرنک یہاں سے نکال کر لے گیا۔ اس نے کسی چیز کو چھیڑا اور نہ ہی ٹرنک کو ڈھونڈنے کے لیے اسے اٹھا پٹخ کرنا پڑی" ایک لمحے کو رک کر میں نے سوالیہ نظر سے اسے دیکھا اور پوچھا "کیا یہ غیر معمولی بات نہیں ہے؟"

اس کی آنکھوں میں پائی جانے والی حیرت میں مجھے جوش کی آمیزش نظر آئی تاہم یہ جوش خاصا دبا دبا سا تھا۔ وہ قدرے دھیمی آواز میں بولا۔

"تھانے دار صاحب! اس طرف تو میرا دھیان ہی نہیں گیا تھا۔"

"اب دھیان گیا ہے تو کیا کہتے ہو؟" میں نے پوچھا۔

وہ بولا "واقعی، آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ لگتا ہے، چور کو اچھی طرح یہ بات معلوم تھی کہ جستی ٹرنک کہاں رکھا گیا تھا۔"

"اور تمہارا یہ دعویٰ ہے کہ یہ راز تم تینوں کے سوا اور کسی کو معلوم نہیں تھا؟"

"اس بات کا تو مجھے پکا یقین ہے سرکار!" وہ پُر وثوق انداز میں بولا۔

"پھر اس نامعلوم چور کے بارے میں کیا کہتے ہو؟"

"کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا جناب!"

"اس میں سمجھ میں نہ آنے والی کون سی بات ہے؟" میں نے قدرے سخت لہجے میں کہا "چوری کی واردات کے شواہد سے پتا چلتا ہے کہ چور جستی ٹرنک کے "قیام و مقام" سے اچھی طرح واقف تھا۔ اب دو ہی صورتیں ہیں" ایک

لہجے کو رک کر میں نے کھوجنے والی نظر سے کرم دین کو دیکھا۔

وہ اضطراری انداز میں گویا ہوا "کون سی دو صورتیں جناب؟"

"پہلی صورت تو یہ ہے کہ تم تینوں میں سے کسی نے جستی ٹرنک کے راز کو افشا کیا ہے" میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا "اور دوسری صورت یہ ہے کہ تمہارا دعویٰ کھوکھلا ہے۔"

وہ الجھن زدہ لہجے میں بولا "کون سا دعویٰ جناب؟"

"وہی دعویٰ کرم دین" میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا "کہ تم تینوں کے سوا کوئی چوتھا شخص اس راز سے واقف نہیں۔"

وہ پریشانی سے مجھے تکنے لگا۔

میں نے کہا "میری بات غور سے سنو کرم دین! اگر واقعی تم لوگوں نے کسی اور شخص کو اس جستی ٹرنک کی بھنک بھی نہیں پڑنے دی تھی تو پھر پورے وثوق سے یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ تمہارے علاوہ بھی کوئی شخص تمہاری "متاعِ حیات" سے آگاہ تھا۔ اب وہ شخص خود چور بھی ہوسکتا ہے اور کوئی ایسا شخص بھی ہوسکتا ہے جس نے کسی چور سے تمہارے گھر میں چوری کروائی ہو" ایک لمحے کے وقفے سے میں نے حتمی انداز میں کہا "کرم دین! اس چوری میں کسی "بھیدی" کا ہاتھ نظر آرہا ہے۔"

وہ تائیدی انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولا "کہہ تو آپ بالکل ٹھیک رہے ہیں مگر ایسا شخص کون ہوسکتا ہے؟"

"یہ تو تم ہی بتاسکتے ہو" میں نے کہا۔

"میرے دماغ میں تو کوئی نام نہیں آرہا۔"

میں نے پُرزور الفاظ میں کہا "کرم دین! تم نے بتایا تھا کہ جب تم بیدار ہونے کے بعد چھت سے نیچے آئے تو گھر کا بیرونی دروازہ کھلا ہوا تھا" اس نے اثبات میں سرہلایا۔ میں نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا "اور تمہارا کہنا ہے کہ رات تم نے سونے سے پہلے بیرونی دروازے کو تالا بھی لگایا تھا" ایک لمحے کو رک کر میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکا اور کہا "اس سے بھی یہی بات ظاہر ہوتی ہے کہ چور تمہارے اور تمہارے گھر کے بارے میں وسیع معلومات رکھتا تھا۔ ممکن ہے، اس کے پاس تمہارے گھر کے بیرونی دروازے پر لگے تالے کی چابی بھی ہو!"

وہ بے یقینی سے مجھے دیکھنے لگا اور کمزور سی آواز میں بولا "میری سمجھ میں کچھ نہیں آرہا ہے تھانے دار صاحب!"

میں نے کہا "کرم دین! ابھی تھوڑی دیر پہلے تم نے اپنی گھروالی سے جو بحث مباحثہ کیا ہے، اس سے میں نے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ زینت کی بہن شائستہ بیگم تمہارے اس فیصلے سے سخت ناخوش تھی کہ تم نکو کی شادی اپنے بھتیجے قادر بخش سے کرنے جارہے تھے؟"

"یہ بات تو ہے سرکار!" وہ ہاں میں گردن ہلاتے ہوئے بولا "میری سالی شائستہ تو کیا، خود میری گھروالی زینت بھی میرے اس فیصلے سے خاصی چڑی ہوئی ہے۔ بات بات پر طعنے دیتی ہے اور لڑائی جھگڑے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتی۔"

کرم دین کے اس تبصرے پر زینت نے ناگواری سے گھور کر شوہر کو دیکھا مگر زبان سے کچھ نہ کہا۔ میں نے زینت کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"تمہاری کیا رائے ہے اس سلسلے میں؟"

"اس میں کسی رائے کی کیا ضرورت ہے؟" وہ منہ ٹیڑھا کرتے ہوئے بولی "جب کسی کی خواہش کو بری طرح رد کیا جاتا ہے تو ناراضی پیدا ہو ہی جاتی ہے۔ آخر میرے بھانجے نادر علی میں کس چیز کی کمی تھی۔ وہ خوبصورت ہے، جوان ہے، صاحبِ حیثیت ہے۔ کیا نہیں ہے اس کے پاس؟"

میں نے اس کی تقریر کو ہاتھ کے اشارے سے بریک لگاتے ہوئے کہا "زینت! تمہارے خیال میں یہ دشمنی کرنے کی ہوگی؟"

وہ الجھن زدہ انداز میں مجھے دیکھنے لگی، میں نے وضاحتی لہجے میں کہا "میرا مطلب یہ ہے کہ اس چوری میں تمہارے کسی دشمن کا ہاتھ ہوسکتا ہے۔ ظاہر ہے، یہ کام کوئی دوست تو کر نہیں سکتا۔"

وہ سادہ سے لہجے میں بولی "ہمارا تو کوئی دشمن نہیں تھانے دار صاحب۔ یہ پتا چلانا تو آپ کا کام ہے، چور کون ہے؟ اور اس نے کس دشمنی میں چوری کی ہے۔"

"تم ٹھیک کہتی ہو" میں نے کہا "یہ واقعی میرا کام ہے۔ چوری کی یہ واردات میرے تھانے کی حدود میں ہوئی ہے۔ اس کا سراغ میں ہی لگاؤں گا اور چور کو قرارواقعی سزا بھی دلواؤں گا۔"

دونوں میاں بیوی شکرگزار نظر سے مجھے تکنے لگے۔ میں تھوڑی دیر مزید انہیں تسلی دلاسا دینے کے بعد اے ایس آئی کامی شاہ کے ساتھ تھانے کی جانب روانہ ہوگیا۔ راستے میں ہمارے درمیان جستی ٹرنک کی چوری موضوعِ گفتگو بنی رہی۔ کامی شاہ نے کہا "ملک صاحب! میرا دھیان تو بار بار بو

نگر چور کی طرف جارہا ہے۔"

بوٹا ڈنگر چور کی تازہ ترین واردات کے بارے میں کامی ناہ کو سب کچھ معلوم تھا۔ گزشتہ رات منچن آباد سے اے ایس آئی فیروز بوٹا کی تلاش میں میرے تھانے آیا تھا اور آج صبح مجھے معلوم ہوا تھا کہ وہ بوٹا کے تعاقب میں دریا کی جانب گیا تھا۔ فیروز کے ساتھ کانسٹیبل اللہ دتا اور کھوجی چراغ دین بھی تھے۔

میں نے کہا "کامی شاہ! تم موجودہ حالات کی روشنی میں بالکل درست رخ پر سوچ رہے ہو لیکن میں تمہارے خیال سے مکمل اتفاق نہیں کروں گا۔"

"وہ کیوں ملک صاحب!"

"وہ اس لیے کامی شاہ" میں نے سمجھانے والے انداز میں کہا "میرا یہ تجربہ ہے کہ مویشی وغیرہ کی چوری میں ملوث افراد عموماً دوسری نوعیت کی چوری چکاری میں ہاتھ نہیں ڈالتے۔ ان کا اپنا ایک مخصوص میدان اور طریقۂ واردات ہوتا ہے۔ وہ مالکان کی نظر بچا کر خصوصاً رات میں ڈھور ڈنگر چوری کرتے ہیں اور کسی دوسرے علاقے میں جا کر انہیں فروخت کر دیتے ہیں۔ چوری کے مال کے دام اگرچہ اچھے نہیں ملتے تاہم مال کو جلد از جلد ٹھکانے لگانے کی اہمیت ہوتی ہے۔ اس سلسلے میں مویشی چوروں کے خریدار بھی مخصوص ہوتے ہیں۔ ہو سکتا ہے' بوٹا یہاں موضع لالیکا میں چوری شدہ بھینسیں فروخت کرنے آیا ہو اور اب کسی اور طرف نکل گیا ہو۔"

وہ اثبات میں سر کو جنبش دیتے ہوئے بولا "میں آپ کی بات کو یکسر رد نہیں کر سکتا ملک صاحب مگر میرے ذہن میں وہی بات آرہی ہے جو میں نے آپ کو بتائی ہے۔"

"چلیں' دیکھتے ہیں پردے کے پیچھے سے کیا ظاہر ہوتا ہے" میں نے پرسوچ انداز میں کہا۔

ہم باتیں کرتے ہوئے تھانے آگئے۔ یہاں ہمارے لیے بڑی سنسنی خیز خبریں موجود تھیں۔ منچن آباد والا اے ایس آئی اپنے ساتھیوں کے ساتھ واپس آگیا تھا اور میرے کمرے میں بیٹھا میرا انتظار کر رہا تھا۔

مجھ پر نظر پڑتے ہی وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا "ملک صاحب!" اس نے اضطراری لہجے میں مجھے مخاطب کرتے ہوئے کہا "بوٹا تو ہمارے ہاتھ سے نکل گیا مگر ہم دریا کے کنارے ایک لاش دریافت کر کے آئے ہیں۔"

یہ اطلاع دھماکا خیز تھی۔ میں نے پوچھا "بوٹا تمہارے ہاتھ سے نکل کر کہاں چلا گیا اور یہ لاش کا کیا چکر ہے بھئی!"

اے ایس آئی فیروز نے تفصیل بتاتے ہوئے کہا "ملک صاحب! آج صبح کھوجی چراغ دین نے مجھے بتایا کہ بوٹا کے قدموں کا کھرا ایک جگہ سے دریا کی جانب جاتا ہوا نظر آیا ہے۔ میں فوراً کھوجی کے ساتھ..."

"ایک منٹ!" میں نے قطع کلامی کرتے ہوئے کہا "رات تم نے بتایا تھا کہ تم لوگوں نے اچھی طرح چیک کر لیا ہے' بوٹا اس علاقے میں داخل تو ہوا ہے مگر یہاں سے باہر جانے کے آثار نہیں ملے اور اب تم کہہ رہے ہو کہ صبح چراغ دین نے اس کا کھرا ڈھونڈ نکالا ہے۔ اس کا مطلب تو یہی ہوا نا کہ وہ رات کسی وقت یا صبح صبح یہاں سے روانہ ہوا ہے... اور یہ بھی کہ اس کا قیام اس تھانے سے زیادہ دور نہیں رہا ہوگا؟"

"آپ بجا فرما رہے ہیں ملک صاحب!" فیروز نے تائیدی انداز میں کہا "میں بھی انہی خطوط پر سوچ رہا ہوں۔ افسوس ناک بات تو یہ ہے کہ وہ ہاتھ آتا آتا نکل گیا۔"

"اب یہ بھی بتا دو کہ بوٹا کس طرف نکل گیا ہے؟"

وہ بولا "ہم بوٹا کے قدموں کا "تعاقب" کرتے ہوئے دریا کے کنارے جا پہنچے تھے۔ دریا کے کنارے کا یہ حصہ لالیکا اور قاسمکا کے درمیان پڑتا ہے۔ دریا کی دوسری جانب ضلع ساہیوال ہے۔ مجھے یقین ہے کہ بوٹا دریا کی دوسری سمت فرار ہو گیا ہے کیونکہ ہم نے کنارے کے ساتھ ساتھ مشرق اور مغرب جانب کافی دور تک جا کر دیکھ لیا ہے لیکن کسی بھی طرف اس کا کھرا نہیں مل سکا۔"

"ہوں" میں نے سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا پھر ایک فوری خیال کے تحت پوچھا "فیروز! تم نے مسروقہ سات بھینسوں کے بارے میں کچھ نہیں بتایا" ایک لمحے کے توقف سے میں نے اضافہ کیا "میرا مطلب ہے' ان کے کھرے کا کیا ہوا؟"

فیروز نے جواب دیا "ان کا کھرا نہیں مل سکا جس کا صرف ایک ہی مطلب ہو سکتا ہے۔ بوٹا نے وہ سات بھینسیں یہیں لالیکا ہی میں "ٹھکانے" لگا دی ہیں اور خود دریا پار کر کے ساہیوال کی جانب نکل گیا ہے۔ یہ چور لٹیرے تیراکی کے ماہر ہوتے ہیں۔"

"ہاں' یہ بات تو ہے" میں نے کہا پھر پوچھا "فیروز! تم نے کسی لاش کی دریافت کا بھی ذکر کیا تھا؟"

فیروز نے سنسنی خیز انداز میں بتایا "ملک صاحب! ہم دریائے ستلج کے کنارے کے ساتھ ساتھ بوٹا کا کھرا ڈھونڈ رہے تھے کہ ایک مقام پر ہمیں ایک جستی صندوق پڑا نظر آیا

اور تجسس کے ہاتھوں ہم اس صندوق کے پاس چلے گئے۔۔۔"

اس کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی میں بول اٹھا "جستی صندوق سے تمہاری مراد جستی ٹرنک ہے؟"

فیروز کے انکشاف نے مجھے بے چین کردیا تھا۔ جستی ٹرنک کا ذکر کسی بھی طور نظرانداز کرنے کے قابل نہیں تھا۔ میرے سوال کے جواب میں فیروز نے بتایا۔

"ملک صاحب! آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ میں غلطی سے جستی صندوق کہہ بیٹھا ہوں۔ دراصل وہ جستی ٹرنک ہی تھا اور۔۔۔" ایک لمحے کو رک کر اس نے الجھن زدہ نظر سے مجھے دیکھا اور بولا "اور میں نے جس لاش کا ذکر کیا ہے، وہ اسی صندوق یعنی ٹرنک کے اندر رکھی ہے۔"

کرم دین عرف کرمو کے گھر سے جو جستی ٹرنک چوری ہوا تھا، وہ طلائی زیورات، عروسی ملبوسات اور نقدی وغیرہ سے بھرا ہوا تھا اور اے ایس آئی فیروز کسی جستی ٹرنک میں ایک لاش کا ذکر کررہا تھا۔ کیا ان دونوں ٹرنکوں میں کوئی تعلق ہوسکتا تھا؟

میرے ذہن میں اس وقت متعدد سوالات ڈوب ابھر رہے تھے۔ میں نے صورتِ حال کو واضح کرنے کے لیے مہمان اے ایس آئی سے پوچھا "جستی ٹرنک کے اندر پائی جانے والی لاش کس کی ہے؟"

وہ نفی میں گردن جھٹکتے ہوئے بولا "میں نہیں جانتا ملک صاحب! میرے لیے وہ شخص اجنبی ہے۔ میں نے اپنی اب تک کی زندگی میں اسے پہلے کہیں نہیں دیکھا۔"

"تم نے ٹرنک کو خود کھولا تھا یا وہ پہلے سے کھلا ہوا تھا؟" میں نے پوچھا۔

فیروز نے جواب دیا "ٹرنک تو میں نے ہی کھولا تھا مگر۔۔۔"

"مگر کیا؟" میں نے اس کا جملہ مکمل ہونے سے پہلے ہی کہا۔

وہ بولا "مگر یہ جناب کہ ٹرنک تو بند تھا لیکن اس کا تالا ٹوٹا ہوا تھا۔ وہ ٹوٹا ہوا تالا ٹرنک کی کنڈی میں جھول رہا تھا۔ میں نے اندرونی تجسس کے ہاتھوں ٹرنک کا ڈھکنا اٹھا کر دیکھا تو میرے اوسان خطا ہوگئے۔ اندر ایک نوجوان کی لاش رکھی تھی۔"

"کیا تمہیں یقین ہے کہ وہ شخص مرچکا تھا؟"

"صدفیصد یقین ہے جناب!"

"اس کا مطلب ہے، تمہارا مشاہدہ بڑا گہرا ہے" میں نے خیال انگیز لہجے میں کہا۔

وہ بولا "جناب! میں اپنی تعریف تو نہیں کروں گا مگر یہ حقیقت ہے کہ میرا مشاہدہ اور یادداشت بہت مضبوط ہیں لیکن اس نوجوان کو دیکھ کر تو کوئی بھی کہہ سکتا ہے کہ وہ اب اس دنیا میں موجود نہیں۔"

"کیوں، اس نوجوان کے ساتھ ایسی کیا بات ہے؟" میں نے پوچھا۔

اس نے بتایا "اس کے سینے میں ایک خنجر دستے تک پیوست ہے۔"

"ہوں" میں گہری سوچ میں ڈوب گیا "گویا اس نامعلوم نوجوان کے سینے میں خنجر گھونپ کر اسے حوالۂ موت کیا گیا ہے!"

"بالکل یہی بات نظر آتی ہے ملک صاحب!" اس نے تائید کی۔

میرا ذہن اس وقت بڑی تیز رفتاری سے کام کررہا تھا۔ مختلف واقعات ایک دوسرے کے قریب آرہے تھے۔ کرم دین کے گھر سے قیمتی سازوسامان والا ٹرنک چوری ہوا تھا۔ بوٹا ڈنگر چور دریا کے جس حصے یا مقام سے غائب ہوا تھا، اس کے اریب قریب ہی لاش والا جستی ٹرنک پایا گیا تھا۔ میں مویشی چور بوٹا، نامعلوم مقتول نوجوان اور جستی ٹرنک کے بیچ الجھ کر رہ گیا تھا۔ فوری طور پر جو امکانات نظر آرہے تھے وہ کچھ یوں تھے۔ بوٹا اور نامعلوم مقتول نوجوان نے مل کر کرم دین کے گھر میں نقب لگائی ہوگی۔ وہ جستی ٹرنک کو دریا کے کنارے تک لے آئے ہوں گے۔ یہاں کسی بات پر ان دونوں میں اختلاف ہوگیا ہوگا جس کے نتیجے میں بوٹا نے مذکورہ نوجوان کو موت کے گھاٹ اتار کر ٹرنک کا قیمتی سامان سمیٹا ہوگا اور دریا پار کرکے ساہیوال کی جانب نکل گیا ہوگا۔

ایک دوسری صورت یہ ہوسکتی تھی کہ مقتول نوجوان ہی اصل چور ہو۔ وہ ٹرنک کے ساتھ دریا کے کنارے پہنچا ہو جہاں بوٹا سے اس کی مٹھ بھیڑ ہوگئی ہو اور بوٹا اسے "ٹھکانے" لگا کر چلتا بنا ہو۔

صورت کوئی بھی رہی ہو لیکن ایک بات طے تھی اور وہ یہ کہ نامعلوم نوجوان کو ٹرنک کی قیمتی اشیا ہی کی وجہ سے قتل کیا گیا ہوگا۔ یہ وہ اندازے تھے جو میں نے قائم کیے تھے۔ ان میں کچھ اندازے غلط بھی ثابت ہوسکتے تھے مثلاً میرے اندازوں کی بنیاد اس بات پر تھی کہ جس جستی ٹرنک میں نامعلوم نوجوان کی لاش پائی گئی تھی، وہ وہی ٹرنک تھا جو کرم دین کے گھر سے چوری ہوا تھا۔ اگر ایسا نہیں تھا تو عین ممکن تھا، ایک بالکل مختلف کہانی سامنے آتی۔

میں نے ایک فوری خیال کے تحت اے ایس آئی کا

شاہ سے کہا "تم کسی مستعد کانسٹیبل کو بھیج کر کرم دین کو تھانے بلوالو۔ ہم اسے ساتھ لے کر دریا کی جانب جائیں گے۔ جستی ٹرنک کی شناخت اس کے سوا اور کوئی نہیں کر سکتا۔"

کامی شاہ میرے حکم کی تعمیل کے لیے کمرے سے نکل گیا۔

تھوڑی دیر بعد اس نے آکر بتایا "میں نے کانسٹیبل فقیر احمد کو کرمو چاچا کے گھر کی طرف روانہ کردیا ہے۔"

اس وقت دوپہرا اپنے جوبن پر تھی۔ یہ کھانے کا وقت تھا۔ میں نے کامی شاہ سے کہا کہ وہ مہمانوں کے لیے اور خود اپنے لیے بھی کھانے کا بندوبست کرکے اس نیک کام سے فارغ ہونے کے بعد ہم دریا کی طرف روانہ ہوں گے۔

دراصل میں کرم دین کا انتظار کرنا چاہتا تھا۔ اس کا ساتھ جانا بہت ضروری تھا۔ ویسے میں نے فوری طور پر دو سپاہیوں کو دریا کی جانب بھیج دیا تھا تاکہ وہ جستی ٹرنک کو اپنی نگرانی میں لے لیں۔ یہ احتیاط بہت ضروری تھی۔

ایک گھنٹے کے اندر ہم کھانے سے فارغ ہوگئے۔ اس دوران میں کرم دین بھی تھانے لے آیا جاچکا تھا۔ وہ اس بات سے واقف نہیں تھا کہ اسے یہاں کیوں بلوایا گیا تھا۔ اس نے آتے ہی مجھ سے پوچھا۔

"تھانے دار صاحب! کیا آپ نے چور کو پکڑ لیا ہے؟"

کرم دین کے سوال پر اے ایس آئی فیروز نے چونک کر اسے دیکھا۔ فیروز کو ابھی تک میں نے جستی ٹرنک کی چوری کے بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا۔ فیروز کی الجھن نما حیرت کو دور کرنے کے لیے میں نے مختصر الفاظ میں اسے اس واقعے سے آگاہ کیا۔ پھر کرم دین کے سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا۔

"کرم دین! چور تو ابھی تک ہاتھ نہیں آیا لیکن ایک جستی ٹرنک کی خبر ملی ہے۔"

"کہاں ہے وہ جستی ٹرنک؟" وہ بے تابی سے بولا۔

"دریا کے کنارے پر" میں نے ٹھوس لہجے میں کہا۔

اس نے پوچھا "کیا میرا قیمتی سامان اس میں موجود ہے؟"

"نہیں" میں نے نفی میں گردن ہلائی "تمہارا سامان تو اس میں نہیں پایا گیا البتہ اس کے اندر جو کچھ بھی موجود ہے، وہ بھی کچھ کم قیمتی نہیں ہے۔"

"کیا ہے جی اس ٹرنک کے اندر؟"

"ایک نوجوان شخص کی لاش!" میں نے انکشاف انگیز انداز میں کہا۔

"لاش!" وہ پورے وجود سے کانپ اٹھا "بھیھ..... پھر ..... وہ میرا ٹرنک نہیں ہوسکتا۔ میرے ٹرنک میں تو جناب، پندرہ تولے سونے کے زیورات، بیس جوڑے قیمتی ریشمی کپڑے اور پانچ ہزار روپے نقد تھے۔"

میں نے کہا "ممکن ہے، وہ تمہارا ٹرنک نہ ہو۔ میں نے تمہیں اسی لیے تھانے بلوایا ہے کہ تم ہمارے ساتھ دریا پر جاکر اس ٹرنک کی شناخت کرسکو جس میں کسی بدقسمت اور نامعلوم نوجوان کی لاش ملی ہے۔"

وہ زبان سے کچھ نہیں بولا۔ اثبات میں یوں گردن ہلانے لگا جیسے وہ میری بات کی تہ میں پہنچ گیا ہو۔

آئندہ پندرہ بیس منٹ میں ہم تیار ہو کر تھانے سے روانہ ہوچکے تھے۔ میرے ساتھ کرم دین اور کامی شاہ کے علاوہ منچن آباد والے تینوں سرکاری مہمان بھی تھے۔ اس موقع پر کامی شاہ نے ایک مفید تجویز دی، اس نے کہا۔

"ملک صاحب! کیوں نہ ہم کرمو چاچا کے گھر کی طرف سے ہو کر دریا کی جانب جائیں۔"

"اس سے کیا ہوگا؟" میں نے سرسری انداز میں پوچھا۔

وہ بولا "اس وقت ایک ماہر کھوجی ہمارے ہم راہ ہے۔ چور جستی ٹرنک چرا کر کرم دین کے گھر سے دریا کی جانب گیا ہوگا تو اس راستے پر اس کے قدموں کا کھرا نکالا جاسکتا ہے کیونکہ دریا کی جانب جانے والا وہ واحد راستہ ہے جو کھیتوں میں سے ہو کر گزرتا ہے۔"

"تجویز تو تمہاری معقول ہے مگر مجھے کامیابی کے زیادہ امکانات نظر نہیں آرہے کامی شاہ!" میں نے کہا "تم میری بات کا مطلب سمجھ رہے ہو نا؟"

کامی شاہ کے بجائے کھوجی چراغ دین بول اٹھا "میں چنگی طراں سمجھ گیا ہوں تھانے دار صاحب!"

کامی شاہ نے سوالیہ نظر سے چراغ دین کو دیکھا۔ وہ سمجھانے والے انداز میں بولا "مجھے جو باتیں پتا چلی ہیں ان کے مطابق کرم دین کے گھر رات کے پچھلے پہر چوری ہوئی ہے۔ اب تک اس واقعے کو دس بارہ گھنٹے گزر چکے ہیں۔ دریا کی سمت جانے کا چونکہ ایک ہی راستہ ہے اس لیے وہاں بے شمار لوگوں کے قدموں کے نشانات ہوں گے جس کی وجہ سے چور کا کھرا نکالنا خاصا مشکل ثابت ہوگا۔ پھر ہم اس کھرے کے نمونے سے بھی ناواقف ہیں" ایک لمحے کے توقف سے اس نے پرسوچ انداز میں کہا "ویسے ایک بات ہے" اتنا کہہ کر وہ خاموش ہوگیا۔

میں نے پوچھا "وہ ایک بات کون سی ہے؟"

اس نے جواب دیا "جناب! اگر میں کرم دین کے گھر سے اپنے "کام" کا آغاز کروں تو ممکن ہے، چور کا کوئی سراغ مل جائے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ چوری کے بعد سے اس گھر میں زیادہ لوگوں کی آمدورفت نہ رہی ہو۔"

"یہ تو ممکن نہیں ہے" کرم دین نے کہا "جب میرے محلے داروں کو پتا چلا کہ میرے گھر میں چوری ہوگئی ہے تو وہ خبرگیری کے لیے میرے پاس آنا شروع ہوگئے تھے اور اب تک تو" ایک لمحے کے توقف سے اس نے اپنی بات کو مکمل کیا "اب تک تو سیکڑوں افراد آکر جا چکے ہیں۔"

بابا چراغ دین سوچ میں پڑگیا اور پھر بولا "مشکل تو ضرور ہے لیکن اگر آپ کا حکم ہو تو میں کوشش کرسکتا ہوں۔"

"تم یہ کوشش ضرور کرو چراغ دین!" میں نے کہا "میں کانسٹیبل اللہ دتا کو تمہارے پاس چھوڑ کر جارہا ہوں۔ تم دونوں قدموں کا سراغ لگاتے ہوئے ہمارے پاس آجانا۔ جب تک ہم اب تک کی صورتِ حال کا جائزہ لیتے ہیں کیونکہ میں جانتا ہوں، کھرا نکالنے کے دوران میں ہماری رفتار بہت سست ہوجائے گی جبکہ میں جلد از جلد دریا کے کنارے پہنچنا چاہتا ہوں۔"

اس موقع پر میں نے کرم دین کے مشورے سے ایک اور آدمی کو بھی چراغ دین کے ہمراہ کردیا تاکہ راستے سے ناواقفیت اس کے کھوج میں رکاوٹ نہ بنے۔ یہ ضروری انتظامات کرنے کے بعد ہم دریائے ستلج کے کنارے کی جانب روانہ ہوگئے۔

مہمان اے ایس آئی فیروز کی معیت میں ہم مطلوبہ مقام پر پہنچ گئے۔ میرے بھیجے ہوئے دونوں چاق وچوبند کانسٹیبلز وہاں موجود تھے۔ ہمیں دیکھتے ہی وہ اٹین شن ہوگئے۔ وہ دونوں دریا کے کنارے لگے ایک درخت کی چھاؤں میں کھڑے تھے۔ جستی ٹرنک پر نگاہ پڑتے ہی کرم دین چیخ اٹھا۔

"جناب! یہ تو میرا ہی ٹرنک ہے۔"

اس کی آواز اتنی بلند تھی کہ قرب وجوار میں دور تک سنائی دی ہوگی۔ میں نے آگے بڑھ کر ٹرنک کا سرسری معائنہ کیا۔ اس کا تالا ٹوٹا ہوا تھا تاہم ڈھکن بند تھا۔ ٹوٹا ہوا تالا کنڈی میں جھول رہا تھا۔ میں نے ٹرنک کا ڈھکن اٹھادیا۔

اے ایس آئی کا بیان صدفی صد درست تھا۔ ٹرنک کے اندر ایک نوجوان کی لاش نظر آرہی تھی۔ مقتول کے سینے میں خنجر پیوست تھا۔ گورے چٹے نوجوان کی عمر اٹھارہ انیس سال سے زیادہ نہیں تھی۔ اس کے چہرے پر ہلکی ہلکی مونچھیں دکھائی دے رہی تھیں۔ وہ ایک صحت مند گبرو تھا۔ ململ کے کرتے کے نیچے اس نے پاپلین کا تہ بند باندھ رکھا تھا۔ اس کا قد چھ فٹ کے قریب تھا۔ اسے ٹرنک میں اس طرح ٹھونسا گیا تھا کہ اس کی ٹانگیں گھٹنوں پر سے مڑی ہوئی تھیں تاہم اوپر کا دھڑ چت انداز میں تھا اور خنجر عین دل کے مقام پر جسم میں داخل کیا گیا تھا۔ وہ ایک سو ایک فیصد مرچکا تھا۔ بڑے حسرت ناک انداز میں وہ موت کا شکار ہوا تھا۔

میں نے نگاہ اٹھا کر کرم دین کو دیکھا اور اشارے سے اسے اپنے قریب بلالیا۔ وہ قریب آیا تو میں نے اس سے کہا۔ "کیا تم اس نوجوان کو جانتے ہو؟"

وہ تھوڑی دیر تک بہ غور نوجوان کی لاش کا جائزہ لیتا رہا پھر نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولا "نہیں سرکار، میں اسے نہیں جانتا۔"

"ہوں!" میں سوچ میں پڑگیا۔

کرم دین نے پوچھا "تھانے دار صاحب! یہ کس کی لاش ہے اور..... اور اس ٹرنک کا سامان کہاں گیا؟"

"میں بھی یہی جاننے کی کوشش کررہا ہوں کرم دین!" میں نے جواب دیا۔

کامی شاہ نے کرم دین سے سوال کیا "کیا تمہیں یقین ہے کہ یہ تمہارا ہی ٹرنک ہے؟"

"میں قسم کھانے کو تیار ہوں جناب!" وہ اپنی بات پر زور دیتے ہوئے بولا "یہ بالکل وہی ٹرنک ہے جس میں، میں نے نگو کے داج کا سامان جمع کیا تھا۔"

صورتِ حال عجیب وغریب ہوگئی تھی۔ وہ جستی ٹرنک دو بائی چار فٹ کا تھا۔ اس میں رکھا گیا قیمتی سامان غائب تھا اور ایک نامعلوم نوجوان کی لاش کو اس میں "فٹ" کردیا گیا تھا۔ ٹرنک کی مجموعی گہرائی سوا فٹ کے قریب تھی جس میں ڈھکن کی اونچائی بھی شامل تھی۔

اس زمانے میں فنگر پرنٹس اٹھانے کا رواج نہیں تھا اور عدالت میں بھی فنگر پرنٹس کو زیادہ اہمیت نہیں دی جاتی تھی۔ میرے تھانے کا سرکاری فوٹوگرافر اس روز موجود نہیں تھا تاہم میں نے کامی شاہ کو یہ فریضہ سونپ دیا تھا۔ دریا کی جانب آنے سے پہلے ہم ایک کیمرا بھی ساتھ لے آئے تھے۔ کامی شاہ کو آرٹ سے بھی دلچسپی تھی اور وہ شاعری بھی کرتا تھا۔

میرے حکم پر کامی شاہ نے جستی ٹرنک اور اس میں موجود انسانی لاش کو مختلف زاویوں سے عکس بند کیا۔ اس دوران میں، میں نے جائے وقوعہ کا تفصیلی نقشہ تیار کرلیا۔ علاقے کے لوگوں کو پولیس کی اس سرگرمی کا علم ہوچکا

تھا کیونکہ رفتہ رفتہ وہاں لوگ جمع ہو رہے تھے۔ جب کھوجی بابا چراغ دین اپنی "تحقیق" کرتے ہوئے جائے وقوعہ پر پہنچا تو وہاں تقریباً تین درجن افراد اکٹھا ہو چکے تھے۔ اس کے علاوہ درجن بھر افراد کھوجی کے ساتھ بھی وہاں چلے آئے تھے۔

میں نے چراغ دین کو مخاطب کرتے ہوئے پوچھا "کیا رپورٹ ہے چاچا؟"

"رپورٹ اچھی ہے" وہ سنجیدہ لہجے میں بولا "مگر بہت زیادہ اچھی نہیں ہے۔"

"ذرا کھل کر بتاؤ چراغ دین" میں نے کہا "بجھارتیں کیوں ڈال رہے ہو؟"

وہ کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے بولا "جناب! میری کیا مجال جو بجھارتیں ڈالوں" پھر وہ سہلاتے ہوئے کہنے لگا "میرا مطلب یہ تھا کہ مجھے اپنے مقصد میں جزوی کامیابی ہوئی ہے۔"

"ہاں ہاں' بتاؤ" میں نے جلدی سے کہا۔

وہ بولا "جزوی طور پر میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ کرم دین کے گھر سے دو افراد پہلو بہ پہلو چلتے ہوئے باہر نکلے ہیں۔ راستے میں کسی کسی مقام پر ان کا کھرا ملا ہے مگر اس طرح کہ کبھی ایک آگے آگے چلا ہے اور کبھی دوسرا' پھر کھیتوں میں تقریباً نہ ہونے کے برابر ان کے کھرے کے آثار ملے ہیں مگر یہاں دریا کے کنارے کے پاس آکر کئی مقامات پر ان کا کھرا دیکھنے کو ملا ہے۔"

"اور اس کے بعد؟" میں نے پوچھا۔

"اس کے بعد دریا کے کنارے کے ساتھ ساتھ دوبارہ "محنت" کرنا ہوگی۔"

میں چراغ دین کی بات کی تہ تک پہنچ گیا اور کہا "تو محنت کرنے سے تمہیں کس نے روکا ہے۔ پہلے صبح تم بوٹا کے کھرے کو کھوجنے کے لیے محنت کر چکے ہو۔ اب ان دو نامعلوم افراد کے لیے محنت کر ڈالو لیکن..."

میں نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا' چراغ دین نے کہا "لیکن کیا تھانے دار صاحب؟"

میں نے ٹرنک میں دھری نامعلوم نوجوان کی لاش کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا "لیکن یہ کہ تم اس "محنت" سے پہلے ذرا سا یہ کام کر لو کہ مقتول کے پاؤں کا باریک بینی سے جائزہ لے ڈالو۔ تمہاری تجربہ کار اور کھرا شناس نظر فوراً بتا دے گی کہ آیا یہ بدقسمت انہی دو افراد میں سے ایک ہے یا نہیں!"

"میں آپ کی بات سمجھ گیا جناب!" وہ تائیدی انداز میں بولا "میں فوراً اس بات کا پتا چلا لوں گا۔"

آئندہ دس پندرہ منٹ کی "تفتیش" اور ماہرانہ معائنے کے بعد چراغ دین نے فیصلہ کن لہجے میں کہا "میں شرط لگانے کو تیار ہوں۔ میں نے جن دو افراد کا ذکر کیا ہے' ان میں سے ایک یہی شخص ہے۔"

چراغ دین کا انکشاف نما دعویٰ توجہ طلب تھا۔ اس سے یہی بات ظاہر ہوتی تھی کہ نامعلوم مقتول جستی ٹرنک کی چوری میں ملوث تھا۔ رہ گئی اس کے ساتھی کی بات۔ تو اس سلسلے میں فی الحال یہی کہا جا سکتا تھا کہ وہ جو کوئی بھی تھا مگر بوٹا ڈنگر چور نہیں تھا۔ مقتول کے ساتھی کا کھرا بوٹا کے کھرے سے قطعی مختلف تھا۔ بوٹا کے قدموں کے نشانات کرم دین کے گھر کے قرب و جوار میں کہیں بھی نہیں پائے گئے تھے۔ گویا اگر بوٹا سے مقتول اجنبی نوجوان کی ملاقات ہوئی تھی تو دریا کے کنارے پر ہی ہوئی ہوگی۔ کسی حتمی نتیجے پر پہنچنے کے لیے میں نے چراغ دین سے کہا۔

"چاچا! تم جلدی سے وہ "محنت" کر ڈالو جس کا ابھی تھوڑی دیر پہلے ذکر ہو رہا تھا۔"

"ہنے لو جی!" وہ کمر پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولا۔ اگلے ہی لمحے وہ اپنا کام میں مصروف ہو چکا تھا۔

میں مہمان اے ایس آئی سے بات چیت کرنے لگا "فیروز! اب تمہارا کیا ارادہ ہے؟"

"میں سمجھا نہیں جناب!" وہ الجھی ہوئی نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔

میں نے کہا "تم مویشی چور بوٹا کی تلاش میں یہاں آئے تھے لیکن وہ تو دریا پار ساہیوال کی طرف نکل گیا ہے' گویا لا لیکا میں اب تمہارا کوئی کام نہیں رہا۔"

"آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں ملک صاحب!" وہ بولا "میں اپنے سینئرز تک اپنی کارکردگی کی رپورٹ پہنچا دوں گا۔ اگر احکام ملیں گے تو ساہیوال میں بھی ٹرائی کروں گا۔"

"تمہیں یہ ٹرائی ضرور کرنا چاہیے" میں نے کہا "ویسے تمہارے سینئرز احکام صادر کریں یا نہ کریں مگر میں بوٹا کا سراغ لگانے کی پوری کوشش کروں گا۔ کیونکہ اب آپ لوگوں سے زیادہ مجھے بوٹا کی تلاش ہے۔"

وہ کریدنے والے انداز میں بولا "اس کا مطلب ہے' آپ اس لاش کے سلسلے میں بوٹا کو تلاش کرنا چاہتے ہیں؟"

"کئی ایک سلسلے ہیں فیروز!" میں نے مبہم انداز میں کہا "کرم دین کے گھر ہونے والی چوری' نامعلوم نوجوان کا قتل وغیرہ وغیرہ۔ سب سے ضروری مسئلہ تو مجھے یہ درپیش ہے کہ

مقتول کون ہے؟ کہاں کا رہنے والا ہے؟"

"ہاں' یہ جاننا تو واقعی بہت ضروری ہے" فیروز نے تائید کی۔

میں نے وہاں موجود تمام افراد کو باری باری نوجوان مقتول کی شکل دکھائی اور اس کی شناخت کے سلسلے میں استفسار کیا مگر نہایت ہی حوصلہ شکن نتائج برآمد ہوئے۔ وہ لڑکا کے باسیوں کے لیے بالکل اجنبی تھا جس کا ایک ہی مطلب ہو سکتا تھا کہ وہ شخص کسی اور علاقے کا رہنے والا تھا۔

آدھے گھنٹے کے بعد کھوجی چراغ دین واپس آگیا۔ اس کی رپورٹ میں سب سے اہم بات یہ تھی کہ مقتول کے ساتھی کا کھرا ایک آدھ مقام سے مل گیا تھا جس سے اندازہ ہوا تھا کہ وہ بہاول نگر شہر کی جانب گیا تھا۔ اس ادھورے کھرے سے صرف اس کی سمت کا تعین ہو سکا تھا۔ یہ بات یقین سے نہیں کہی جا سکتی تھی کہ وہ واقعی بہاول نگر شہر ہی گیا تھا یا کسی اور جانب نکل گیا تھا۔ میرے نزدیک یہ نامعلوم شخص بوٹا کی بہ نسبت زیادہ "مطلوب" تھا کیونکہ کرم دین کے گھر سے وہ مقتول کے ساتھ ساتھ دریا کے کنارے پہنچا تھا۔ اس بات کے امکانات بہت قوی تھے کہ اسی مطلوب شخص نے ٹرنک میں موجود نوجوان کو موت کے گھاٹ اتارا ہوگا۔ ممکن ہے' دریا کے کنارے پہنچ کر ان دونوں میں کسی بات پر اختلاف ہو گیا ہو جس کے نتیجے میں ایک کو جان سے ہاتھ دھونا پڑے ہوں اور دوسرا ٹرنک کا قیمتی سازوسامان سمیٹ کر چلتا بنا ہو۔ فی الحال اسی رخ پر سوچا جا سکتا تھا۔

دریا کے کنارے پر مزید ہمارا کوئی کام نہیں تھا لہٰذا ہم جستی ٹرنک کے ساتھ واپس تھانے آگئے۔ مہمان اے ایس آئی فیروز اپنے دونوں ساتھیوں کے ہمراہ منچن آباد واپس لوٹ گیا اور میں کامی شاہ کے ساتھ موجودہ صورتِ حال پر گفتگو کرنے لگا۔ کرم دین کو بھی ہم نے گھر بھیج دیا تھا۔

کامی شاہ نے کہا "ملک صاحب! آپ کا کیا خیال ہے' بوٹا ڈنگر چور نامعلوم نوجوان کے قتل میں کس حد تک ملوث ہو سکتا ہے؟"

"میرے خیال میں اس کے ملوث ہونے کے امکانات زیادہ نہیں ہیں۔"

"مگر فیروز کا تو کہنا ہے کہ..."

میں نے کامی شاہ کی بات مکمل نہیں ہونے دی اور کہا "فیروز بہت بے وقوف تفتیشی افسر ہے۔ میں اس کی کارکردگی سے مطمئن نہیں ہوں۔ وہ احمق واپس چلا گیا جبکہ میرے حساب سے اسے دریا کے اس پار جانا چاہیے تھا۔ جہاں سے ہمیں جستی ٹرنک ملا ہے' وہاں سے تھوڑے ہی فاصلے پر دریا کے اوپر پل واقع ہے۔ وہ لوگ بہ آسانی دوسری طرف جا کر بوٹا کے کھرے کا تعاقب کر سکتے تھے' ایک لمحے کو رک کر میں نے اپنی بات مکمل کر دی "فیروز کا خیال تو یہ ہے کہ بوٹا تیر کر دریا کے اس پار گیا ہوگا۔ آج کل دریا پوری طرح بھرا ہوا ہے۔ جون' جولائی اور اگست کے مہینوں میں تو یہ اپنی جولانی پر ہوتا ہے۔ جب ایک ڈیڑھ فرلانگ کے فاصلے پر باقاعدہ پل موجود ہو تو کون احمق تیر کر دریا پار کرنے کی کوشش کرے گا۔"

"آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں" کامی شاہ نے اثبات میں گردن ہلائی۔

میں نے کہا "مجھے نوّے فیصد یقین ہے کہ نامعلوم نوجوان کا قاتل وہی شخص ہے جو اس کے ساتھ ساتھ کرم دین کے گھر سے دریا کے کنارے تک پہنچا تھا اور بعد ازاں بہاول نگر شہر کی جانب نکل گیا ہے۔"

کامی شاہ بولا "ملک صاحب! آپ نے یہ بہت اچھا کیا کہ بوٹا ڈنگر چور' نامعلوم نوجوان مقتول اور نامعلوم متوقع قاتل کا کھرا محفوظ کر لیا ہے۔ اب ہم اپنے کھوجی سے بھی کام لے سکتے ہیں۔"

"ہم اپنے کھوجی دین محمد سے ضرور کام لیں گے" میں نے تیقن سے کہا "میں نے خاص طور پر اس کے لیے کھرے کے وہ نمونے حاصل کیے ہیں۔ میں ابھی دین محمد کو تھانے بلوا کر خصوصی ہدایات دیتا ہوں۔"

کامی شاہ نے کہا "آئندہ کے لیے آپ نے کیا لائحہ عمل تیار کیا ہے؟"

"لائحہ عمل تو تمہارے مشورے ہی سے طے کیا جائے گا" میں نے کہا "فی الحال تو مقتول کی شناخت کا مسئلہ درپیش ہے۔ اگر یہ معلوم ہو جائے کہ وہ کون ہے اور کہاں کا رہنے والا ہے تو ہمیں اس پر ہاتھ ڈالنے میں آسانی رہے گی۔"

کامی شاہ نے کہا "میں سمجھتا ہوں' اگر مقتول کا ساتھی ہمارے قابو میں آجائے تو نہ صرف یہ کہ مقتول کی شناخت کا مسئلہ حل ہو جائے گا بلکہ کرم دین کے گھر ہونے والی چوری کا راز بھی کھل جائے گا اور مالِ مسروقہ تک پہنچنے میں بھی ہمارے لیے بہت آسانیاں پیدا ہو جائیں گی۔"

میں نے کہا "کامی شاہ! میری ایک بات ذہن نشین کر لو۔ جب تک مقتول کی شناخت نہیں ہوگی' ہم متوقع قاتل تک نہیں پہنچ پائیں گے۔"

وہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولا "آپ کی بات دل میں اتر رہی ہے۔ لالیکا میں ہم نے جس شخص سے بھی مقتول کے بارے میں استفسار کیا ہے' اس نے اپنی لاعلمی کا ہی اظہار کیا ہے جس سے یہ بات بڑی حد تک واضح ہوگئی ہے کہ وہ شخص لالیکا کا رہنے والا نہیں ہے۔"

"مقتول کی شناخت کے لیے تمہاری فوٹوگرافی کام آئے گی کامی شاہ!" میں نے پھر پوچھا "تم کب تک یہ تصویریں تیار کرلوگے؟"

وہ سینے پر ہاتھ مارتے ہوئے بولا "ملک صاحب! میں اگرچہ پیشہ ور فوٹوگرافر نہیں ہوں لیکن میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ کل صبح آپ کی آمد سے قبل اس فوٹوگرافی کا مثبت نتیجہ آپ کی میز پر رکھا نظر آئے گا۔"

"ویری گڈ!" میں نے سراہنے والے انداز میں کہا۔

کامی شاہ کا سینہ فخر سے پھول گیا۔

میں نے اپنے ساتھ کام کرنے والوں کا ہمیشہ خیال رکھا ہے اور "کام" کے آدمی کی تو میں بہت قدر کرتا ہوں۔ کامی شاہ کا باپ بہ ذات خود پولیس ڈیپارٹمنٹ سے وابستہ رہا تھا اس لیے بھی کامی شاہ میں بہت سی خوبیاں دیکھنے کو ملتی تھیں۔ اس کی مثبت اور مفید تربیت میں اس کے باپ کا نمایاں ہاتھ تھا۔ میں اہم نوعیت کے کیسز میں کامی شاہ کو اپنے ساتھ رکھنا پسند کرتا تھا۔ دوسروں کی بہ نسبت وہ آسانی سے میری بات سمجھ جاتا تھا۔ گویا ہمارے درمیان خصوصی انڈر اسٹینڈنگ تھی۔

میں نے اسی روز کھوجی دین محمد کو اس کا کام سمجھادیا۔ اس کے ساتھ ہی نامعلوم مقتول نوجوان کی لاش کو پوسٹ مارٹم کے لیے ضلعی اسپتال بھجوادیا۔ پھر میں روزمرہ کے کاموں میں مصروف ہوگیا۔

دوسری صبح وعدے اور دعوے کے مطابق کامی شاہ نے اپنا کام کر دکھایا تھا۔ میں حسب معمول تیار ہوکر تھانے پہنچا تو تصویروں والا خاکی لفافہ میری میز پر رکھا ہوا تھا۔

میں نے لفافہ کھول کر دیکھا۔ اس میں پوسٹ کارڈ سائز کی آٹھ تصویریں موجود تھیں جو مختلف زاویوں سے کھینچی گئی تھیں مگر ان میں سے صرف چار ایسی تھیں جن میں مقتول کا چہرہ واضح طور پر نظر آرہا تھا۔ شناخت کے مقصد کو یہی چار تصویریں پورا کرسکتی تھیں۔ میں نے ان تصاویر کے مزید پرنٹس تیار کروائے اور لالیکا کے آس پاس پائے جانے والے گاؤں اور قصبات میں بھجوادیے تاکہ مقتول کی شناخت کا مسئلہ حل ہوسکے۔ ان علاقوں میں قاسمکا' چک سرکار' چک عبداللہ' دولت پور' تخت محل' نجیب آباد' ملک پورہ اور ٹوبا بلوچاں شامل تھے۔

دوسرے روز کھوجی دین محمد میرے پاس رپورٹ پیش کرنے آیا تو اس کا منہ اترا ہوا تھا۔ دین محمد کی یہ حالت میرے لیے غیر متوقع نہیں تھی۔ گزشتہ روز شام سے پہلے بارش شروع ہوگئی تھی اور رات میں بھی وقفے وقفے سے مینہ برستا رہا تھا جس کی وجہ سے دین محمد کے کام کا سوا ستیاناس ہوگیا تھا۔

وہ شکست آمیز آواز میں بولا "ملک صاحب! ساری محنت کھوکھاتے گئی۔ لگتا ہے' میرا ستارہ گردش میں ہے۔"

"تمام ستارے ہروقت گردش میں رہتے ہیں دین محمد!" میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا "ان کے لیے حکم خداوندی یہی ہے' اس لیے ستاروں کی گردش سے اپنی کامیابیوں اور ناکامیابیوں کو منسوب نہیں کرنا چاہیے۔"

وہ ٹوٹے ہوئے لہجے میں بولا "ملک صاحب! میں نے کل دوپہر تک جو کام کیا تھا' وہ بھی ضائع ہوگیا اور آیندہ کے لیے تو بالکل بھی امید نہیں رہی۔ بارش نے اگلے پچھلے سارے کھرے مٹادیے ہیں۔"

"مایوسی گناہ ہے دین محمد!" میں نے ڈانٹ آمیز انداز میں کہا "قدرت کی طرف سے اگر ایک راستہ بند ہوتا ہے تو اس سے کہیں زیادہ بہتر راستہ کھل جاتا ہے۔ انسان کو باعمل ہونا چاہیے۔ وہ تم نے سنا نہیں... عمل سے زندگی بنتی ہے' جنت بھی جہنم بھی۔"

"جی ہاں' سنا ہے... سنا ہے" وہ بیچ میں بول پڑا۔

"سنا ہے تو اچھی بات ہے" میں نے قطع کلامی کا برا منائے بغیر کہا "اور اگر نہیں سنا تو کان کھول کر سن لو۔ قدرت کسی بھی شخص کی محنت کو رائیگاں نہیں جانے دیتی۔ محنت ضرور پھلتی ہے۔ اگر گزشتہ روز کی بارش نے کھرے کے سلسلے میں ہمیں مایوس کیا ہے تو انشاء اللہ مطلوبہ لوگوں تک پہنچنے کے لیے ہمیں کوئی دوسرا وسیلہ حاصل ہوجائے گا۔ ہماری محنت ضرور رنگ لائے گی دین محمد۔ تم دیکھ لینا' میں محنت کے نتائج پر کامل یقین رکھتا ہوں۔"

دین محمد کھوجی کچھ دیر تک میرے پاس بیٹھا تازہ ترین حالات پر بات چیت کرتا رہا پھر اٹھ کر چلا گیا۔ وہ پورا دن میں تھانے میں مصروف رہا۔ کچھ فوری نوعیت کے معاملات کے لیے میرا تھانے میں رہنا ضروری ہوگیا تھا۔

رات کو جب میں اپنی ڈیوٹی ختم کرکے کمرے سے نکلنے لگا تو کامی شاہ میرے پاس آگیا اور بوجھل لہجے میں بولا "ملک

صاحب! ایک بری خبر ہے۔"
"وہ کیا بھئی؟" میں بھی پریشان ہو گیا۔
"اطمینان سے بیٹھ جائیں تو بتاتا ہوں" اے ایس آئی کامی شاہ نے کہا۔
میں اپنی کرسی پر بیٹھ گیا اور سوالیہ نظر سے کامی شاہ کو تکنے لگا۔
وہ کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولا "ملک صاحب! چاچا کرموں کا انتقال ہو گیا ہے۔"
"کب؟" میں اچھل پڑا۔
"آج شام سے تھوڑی دیر پہلے" اس نے بتایا۔
میں نے بے یقینی کے عالم میں پوچھا "تمہارا مطلب ہے کرم دین کی موت واقع ہو گئی ہے۔ وہی کرم دین جس کے گھر میں دو روز قبل چوری ہو گئی تھی؟"
"جی ہاں، میں اسی کرم دین عرف چاچا کرمو کی بات کر رہا ہوں۔"
میں نے افسوس بھرے انداز میں سرہلاتے ہوئے پوچھا "یہ کیسے ہوا بھئی؟"
"تفصیل تو مجھے معلوم نہیں ملک صاحب!" کامی شاہ نے بتایا "مجھے بھی ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی پتا چلا ہے۔ سنا ہے، آج صبح اس کے گھر میں کچھ مہمان آئے ہوئے تھے۔ مہمانوں کے جانے کے بعد کرمو کی طبیعت خراب ہو گئی پھر شام سے ذرا پہلے اس کی روح قفسِ عنصری سے پرواز کر گئی۔"
میں نے دکھ بھرے لہجے میں کہا "یہ تو واقعی بہت بری خبر ہے۔"
"ملک صاحب! میرا خیال ہے، ہمیں فوراً کرم دین کے گھر جانا چاہیے" کامی شاہ نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔
میں جلدی سے بولا "تمہارا خیال انتہائی نیک اور بروقت ہے" پھر میں نے اپنی جیبوں کو ٹٹولتے ہوئے کہا "چلو میں تیار ہوں۔"
وہ بھی تلا بیٹھا تھا، اٹھ کر کھڑا ہوتے ہوئے بولا "چلیں جناب!"
میں نے اپنی جیبوں میں ہاتھ ڈال کر یہ اطمینان کر لیا تھا کہ میرے لباس میں کاغذ قلم موجود تھا۔ یہ ہمیشہ سے میری عادت رہی ہے کہ میں اپنے پاس کاغذ قلم ضرور رکھتا ہوں۔ یہ میرے پیشے کا تقاضا بھی ہے۔ ان دونوں چیزوں کی کسی بھی وقت مجھے ضرورت پیش آسکتی تھی۔
اگر عام حالات میں کرم دین کی موت کی خبر مجھ تک پہنچتی تو شاید میں اس کے گھر جانے کا فیصلہ نہ کرتا لیکن آج کل وہ جن حالات سے گزر رہا تھا اس کا یہی تقاضا تھا کہ اس کے ساتھ ذرا سی بھی اونچ نیچ ہونے کی صورت میں مجھے فوراً اس کی خبر گیری کے لیے جانا چاہیے تھا۔
جب ہم کرم دین کے گھر پہنچے تو ہم نے وہاں کی فضا کو سوگوار اور ماتمی پایا۔ بہت جلد اس بات کی تصدیق ہو گئی کہ کرم دین واقعی اب اس دنیا میں نہیں رہا تھا۔
میں نے پہلی فرصت میں مرحوم کی بیوی زینت بی بی سے ملاقات کی۔ اس کی مناسب اور سچی اشک شوئی کے بعد میں نے اس سے کرم دین کے انتقال کے بارے میں دریافت کیا۔ اس وقت تک وہ خود کو کافی حد تک سنبھال چکی تھی۔ میرے سوالات کے جواب میں اس نے مختصراً بتایا۔
"تھانے دار صاحب! آج صبح فورٹ عباس والے آئے تھے۔"
"کون فورٹ عباس والے؟"
"وہی جناب، کرمو کا بڑا بھائی اور بھابی!" زینت نے اکتاہٹ آمیز لہجے میں بتایا۔
میں نے کہا "تمہارا مطلب ہے، فضل دین اور شائستہ بیگم؟"
"اونہہ! فضل دین اور شائستہ بیگم!" وہ نفرت بھرے انداز میں بولی۔ پھر کہا "میں تو کہتی ہوں، وہ بے دین اور ناشائستہ بیگم ہیں۔"
زینت کے لہجے کی کڑواہٹ سے میں نے اندازہ لگالیا کہ وہ اپنے جیٹھ اور جیٹھانی کو سخت ناپسند کرتی تھی۔ شاید اس کی ایک بنیادی اور اہم وجہ یہ رہی ہو کہ وہ دونوں اپنے بیٹے کی شادی نگو سے کرنے والے تھے جبکہ زینت کی خواہش تھی کہ اس کی بیٹی نگہت پروین عرف نگو اس کے بھانجے نادر علی کی دلہن بنے۔
میں نے ٹٹولنے والے انداز میں پوچھا "کیا وہ دونوں چوری والے سانحے پر افسوس کرنے آئے تھے؟"
"ہونا تو یہی چاہیے تھا تھانے دار صاحب!" وہ طنزیہ لہجے میں بولی۔
میں نے کہا "تمہارے انداز سے لگتا ہے، ایسا ہوا نہیں۔ کیوں، میں ٹھیک کہہ رہا ہوں نا؟"
وہ سر کو اثباتی جنبش دیتے ہوئے بولی "آپ سولہ آنے درست کہہ رہے ہیں جناب!" ایک لمحے کے توقف سے اس نے بات کو آگے بڑھایا "میرا بھی یہی خیال تھا کہ وہ ہمیں تسلی دلاسا دینے آئے ہیں مگر جب انہوں نے بات چیت شروع کی تو ان کی اصلیت عیاں ہو گئی... وہ "اصلیت" جو میں تو اچھی

طرح جانتی تھی مگر کرمو ہی نے اپنی آنکھوں پر پٹی باندھ رکھی تھی۔ وہ بھائی کے خلاف ایک لفظ سننے کو تیار نہیں ہوتا تھا۔"
میں نے اصل موضوع کی طرف آتے ہوئے کہا "فضل دین اور اس کی بیوی نے آپ لوگوں سے کیا کہا تھا؟"
"کہنا کیا تھا جی!" وہ ہاتھ کو فضا میں ایک مخصوص حرکت دیتے ہوئے بولی "انہوں نے پہلے تو سرسری انداز میں ہماری چوری پر افسوس کیا پھر دونوں میاں بیوی تنہائی میں بیٹھ کر آپس میں کافی کھسر پھسر کرتے رہے۔ آدھے گھنٹے بعد فضل دین نے فیصلہ سنا دیا" ایک لمحے کو رک کر زینت نے امتحانیہ نظر سے مجھے دیکھا اور سوال کیا "آپ جانتے ہیں، فضل دین نے کیا فیصلہ سنایا تھا؟"
اگرچہ میں اس معاملے کی تہ تک پہنچ گیا تھا تاہم میں نے متوفی کی بیوہ کی زبانی سننے کو ترجیح دی اور نفی میں گردن ہلاتے ہوئے کہا "نہیں، مجھے کچھ اندازہ نہیں ہے۔"
"آپ کو کیا، کسی کو بھی اندازہ نہیں ہو سکتا" وہ ایک ترنگ میں بولی "فضل نے اپنے کمینے پن اور لالچی فطرت کا اتنا "شاندار" مظاہرہ کیا تھا کہ کسی کا دھیان اس طرف جا ہی نہیں سکتا۔"
"میں سننے کو بے چین ہوں" میں نے مصنوعی اشتیاق کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔
وہ فخریہ لہجے میں بولی "فضل دین نے نہایت ڈھٹائی سے یہ فیصلہ سنا دیا تھا کہ وہ اب نگو کو اپنی نونہہ (بہو) نہیں بنا سکتا۔ اس نے قادر بخش کی شادی نگو سے کرنے سے صاف انکار کر دیا تھا۔"
"اوہ!" میں نے ایک طویل سانس خارج کی۔ میرا اندازہ بالکل درست ثابت ہوا تھا۔ میں نے بھی جو کچھ سوچا تھا اس کا نتیجہ یہی نکلتا تھا۔
"دیکھا آپ نے، اس کم ذات کا کمینہ پن؟" بات کرتے ہوئے زینت کے لہجے سے نفرت کی چنگاریاں سی چھوٹ رہی تھیں۔
"واقعی، یہ تو بہت ہی برا ہوا زینت بی بی!" میں نے ہمدردانہ لہجے میں کہا۔
وہ بپھرے ہوئے لہجے میں بولی "یہ تو جو برا ہوا تھا سو ہوا تھا۔ اس سے بھی کہیں زیادہ برا یہ ہوا تھا نے دار صاحب کہ کرمو یہ صدمہ برداشت نہ کر سکا" اس کی آواز بھرا گئی۔ وہ رندھے ہوئے گلے سے بولی "میں بیوہ ہو گئی اور..... اور میری بچی یتیم۔"
میں کچھ دیر تک خاموش بیٹھا اس کے سنبھلنے کا انتظار کرتا رہا۔ اس کا جذباتی ہیجان قدرے کم ہوا تو میں نے پوچھا "کرم دین کی موت کس طرح واقع ہوئی ہے؟"
وہ آنسو پونچھتے ہوئے بولی "فضل دین کے، رشتے سے صاف انکار نے کرمو کو بہت افسردہ کر دیا تھا۔ وہ دوپہر سے شام تک مختلف طریقوں سے بھائی اور بھابی کی منت سماجت کرتا رہا کہ کسی طرح وہ اس رشتے سے پیچھے نہ ہٹیں مگر وہ دونوں انتہائی ظالم اور سفاک ثابت ہوئے۔ کرم دین کی اور میری ہر کوشش ناکام ہو گئی۔ وہ اپنے موقف سے ایک سوت اِدھر اُدھر نہ ہٹے اور جب ہمارا اصرار بے حد بڑھ گیا تو وہ یہ کہتے ہوئے ہمارے گھر سے رخصت ہو گئے..... یہ شادی اب ناممکن ہے۔ اگر ایک ہفتے کے اندر اندر داج کا معقول بندوبست کر لو تو پھر کوئی راہ نکالی جا سکتی ہے۔ یہ سہولت بھی ہم اس لیے دے رہے ہیں کہ رشتے داری کا لحاظ ہے ورنہ بغیر جہیز کے شادی کا تو ہم تصور بھی نہیں کر سکتے" یہ کہہ کر وہ ایک لمحے کو خاموش ہوئی پھر سوالیہ انداز میں میری طرف دیکھتے ہوئے بولی "دیکھا آپ نے، رشتے داری کا "لحاظ" کتنا مثالی اور یادگار رہے۔"
زینت کے الفاظ زہر میں بجھے ہوئے تھے۔ وہ جو کہانی سنا رہی تھی، اگر سب کچھ ویسا ہی ہوا تھا تو یہ نہایت ہی افسوس ناک واقعہ تھا۔
میں نے پوچھا "ان کے جانے کے بعد کیا ہوا تھا؟"
"کرم دین ایک چارپائی پر ڈھے گیا تھا" زینت نے بتایا "میں اور نگو اس کی خبر گیری میں لگ گئیں۔ وہ اپنے سینے میں درد کی شکایت کر رہا تھا۔ کچھ دیر تک وہ سینے کو دبا تا رہا پھر سینہ دبانے والے ہاتھوں میں حرکت نہ رہی۔ وہ بے جان ہو گئے تھے۔ ہم نے کرم دین کو ٹٹول کر دیکھا اور دھاڑیں مار کر رونے لگے۔ اس کے صرف ہاتھ ہی نہیں، بلکہ پورا جسم بے جان ہو چکا تھا۔ دو زہریلے "جانوروں" نے اس کی جان نکال دی تھی۔"
میں نے پوچھا "تمہارا اشارہ فضل دین اور اس کی بیوی کی طرف ہے؟"
"جی ہاں" وہ نفرت آمیز لہجے میں بولی "خاص طور پر شائستہ کی طرف۔"
"وہ کیوں زینت؟"
"وہ اس لیے کہ وہی منحوس پھاپا کٹنی اپنے دیور کی قاتل ہے۔"
اس کے جواب نے مجھے چونکا دیا۔ میں نے استفسار کیا "وہ کرم دین کی قاتل کس طرح ہے؟"

زینت نے سلگتے ہوئے انداز میں جواب دیا "تھانے دار صاحب! سچی بات تو یہ ہے کہ شائستہ اپنے بیٹے قادر بخش کی شادی اپنی بھتیجی رضوانہ سے کرنا چاہتی تھی مگر فضل دین نے اس کی مخالفت کرتے ہوئے ہمارے گھر میں اپنے بیٹے کا رشتہ طے کردیا۔ اس فیصلے سے شائستہ کو بہت مرچیں لگیں اور وہ اس رشتے کو ختم کرنے کی تگ و دو میں لگ گئی۔ شائستہ کا بھائی فرید احمد صاحب حیثیت آدمی ہے۔ وہ اپنی بیٹی رضوانہ کو داج میں بہت کچھ دے سکتا ہے۔ یہ دونوں میاں بیوی بنیادی طور پر لالچی اور خودغرض ہیں اسی وجہ سے فضل دین نے نگو کے رشتے کے لیے پندرہ تولے سونے کے زیورات کی شرط لگادی تھی جو کرم دین نے بڑے بھائی کا منہ دیکھتے ہوئے فوراً تسلیم کرلی لیکن جستی ٹرنک کی چوری کے بعد تو ہمارے حالات یکسر بدل چکے ہیں۔ انہی حالات کی مار مارتے ہوئے فضل دین اور شائستہ نے نگو کا رشتہ ختم کردیا ہے" وہ ایک دو لمحے سانس لینے کے لیے رکی پھر بات جاری رکھتے ہوئے بولی "تھانے دار صاحب! میں یہ بات پورے وثوق سے کہہ رہی ہوں کہ فضل نے اپنی بیوی کے دباؤ میں آکر نگو کا رشتہ ختم کیا ہے کیونکہ ایک دو موقع پر آج بھی شائستہ نے رضوانہ کا ذکر کیا تھا.... اور اپنے بھائی کی امارت وغیرہ کا بھی تذکرہ کیا تھا۔"

"تمہاری باتوں سے تو لگتا ہے، شائستہ قادر بخش کی شادی اب اپنی بھتیجی رضوانہ ہی سے کرے گی؟" میں نے سوالیہ انداز میں کہا۔

اس نے اثبات میں جواب دیا "بالکل ایسا ہی ہوگا۔"

میں نے کہا "اور اب تو اس بات کے بھی امکانات پیدا ہوگئے ہیں کہ نگو کی شادی تمہارے بھانجے نادر علی سے ہوجائے!"

"یہ تو بعد کی باتیں ہیں تھانے دار صاحب!" وہ نظر چراتے ہوئے بولی "ابھی تو گھر میں کرم دین کی میت پڑی ہوئی ہے۔ اس کے کفن دفن اور سوئم چہلم سے فارغ ہوجائیں تو دیکھا جائے گا" ایک لمحے کے توقف سے اس نے چھت کی جانب دیکھتے ہوئے فلسفیانہ انداز میں کہا "تھانے دار صاحب! شادی بیاہ تو نصیب سے ہوتے ہیں۔ میری دھی نگو کا نصیب جہاں لکھا ہوگا اس کی شادی وہیں ہوگی۔ آپ اس کے لیے دعا کریں۔"

"ضرور.... ضرور...." میں نے پورے خلوص سے کہا "نگو میری بیٹی ایسی ہے۔ میری دعا ہے کہ اللہ اس کا نصیب اچھا.... بہت اچھا بنادے۔"

"آمین!" کامی شاہ نے دعائیہ انداز میں ہاتھ اٹھا کر کہا۔

میں اٹھ کر کھڑا ہوگیا اور زینت کو مخاطب کرتے ہوئے کہا "میں ایک بار پھر معذرت چاہوں گا کہ اس اندوہناک موقع پر ہم نے تم سے پوچھ پرتیت کی ہے۔ اللہ تمہیں صبر دے۔ کرم دین کی موت تم دونوں (زینت+نگہت) کے لیے بہت بڑا صدمہ ہے۔"

پھر میں نے نگہت پروین کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا "بیٹی! صبر کرو۔ میں تمہارے باپ کو تو واپس نہیں لاسکتا لیکن میں تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ تمہارے داج کا سامان بازیاب کرنے اور اس کو چرانے والے شخص کو قرار واقعی سزا دلوانے کے لیے اپنی بہترین صلاحیتیں صرف کردوں گا۔"

نگو منہ سے کچھ نہ بولی۔ اس کی خاموش آنکھوں کے گھائل گوشوں نے دو موٹے موٹے آنسو اگل دیے جو دھیرے سے اس کے گالوں پر پھسل گئے۔ یہ ایک یتیم لڑکی کی وہ فریاد تھی جو عرش کو جھنجوڑنے کی صلاحیت سے مالا مال ہوتی ہے۔

میرا دل بھر آیا۔ میں نے گردن جھکا کر نگو کے سر پر پیار کیا تو اس کے ضبط کا بندھن ٹوٹ گیا۔ وہ سسک پڑی۔ اس کی سسکاری میں اتنا درد تھا کہ کسی مضبوط چٹان کو ریزہ ریزہ کرسکتا تھا۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میرا اندرون جھنجھنا اٹھا ہو۔ نگو کی بے چارگی دل خون کردینے والی تھی۔

میں شفقت بھرے ہاتھ سے اس کا سر سہلانے لگا۔ تھوڑی دیر بعد اس کی جان لیوا سسکیاں دم توڑ گئیں۔ میں نے شانوں سے تھام کر اسے ایک چارپائی پر بٹھادیا۔ پھر زینت کی جانب متوجہ ہوتے ہوئے کہا۔

"اگر کسی قسم کی میری مدد کی ضرورت ہو تو بلا تکلف بتاؤ۔"

"بس جی، آپ ہمارے لیے دعا کریں" وہ سنجیدگی سے بولی۔

"وہ تو میں ضرور کروں گا" میں نے تہ دل سے کہا۔

زینت نے بتایا کہ کرم دین کی تدفین وغیرہ دوسرے روز نماز ظہر کے بعد کرنے کا پروگرام تھا۔ جب تک تمام رشتے دار نہ آجاتے، میت نہیں اٹھائی جاسکتی تھی۔

میں نے کہا "زینت! میں جنازے میں ضرور شرکت کروں گا۔"

"آپ کا بہت بہت شکریہ تھانے دار صاحب!" وہ ممنونیت آمیز لہجے میں بولی "آپ نے ہمدردی کے دو بول بول کر ہمارا حوصلہ بڑھادیا ہے۔"

میں نے رخصت ہونے سے قبل ایک مرتبہ پھر نگہت

کے سر پر شفقت بھرا ہاتھ پھیرا پھر ہم متوفی کرم دین کے گھر سے باہر نکل آئے۔

نگہت کی دل گرفتہ حالت نے مجھے بہت متاثر کیا تھا۔ وہ انیس بیس سال کی ایک نازک سی لڑکی تھی۔ بالکل کسی خوبصورت اور معصوم گڑیا کے مانند۔ یہ عمر تو زندگی کی شوخیوں اور شرارتوں سے بھرپور استفادہ کرنے کی تھی اور اس بے چاری پر مصیبت کا اتنا بڑا پہاڑ ٹوٹ پڑا تھا جس کے سامنے وہ ایک ذرے کی حیثیت رکھتی تھی اور یہ مصیبت ایک ایسے موقع پر وارد ہوئی تھی جب چند روز بعد وہ دلہن بننے والی تھی۔

ہر لڑکی کی شدید خواہش ہوتی ہے کہ وہ دلہن بنے۔ نگہت بھی اپنے معصوم دل میں اسی خواہش کا دیا جلائے بیٹھی تھی مگر اس کی خوشیوں کو کسی کی نظر لگ گئی تھی۔ بدبختی کی آندھی اس زور سے چلی تھی کہ اس کی متوقع سیج انگاروں کے بستر میں بدل گئی تھی۔

کسی لڑکی کا رشتہ ٹوٹنا بیوگی کے عذاب سے کم دردناک نہیں ہوتا۔ نگہت کو تو وقت کی دودھاری تلوار نے کاٹ ڈالا تھا۔ اسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ بہ یک وقت بیوہ اور یتیم ہو گئی ہو!

ہم بوجھل قدموں اور بجھے والوں کے ساتھ واپس تھانے آ گئے۔

آیندہ روز میں نے کرم دین کے جنازے میں شرکت کی۔ کرم دین کا بڑا بھائی فضل دین بھی اس کی تدفین میں شریک تھا تاہم آج وہ اکیلا ہی آیا تھا۔ اس کے ساتھ نہ تو گھر والی تھی اور نہ ہی دیگر گھر والے۔ میں نے فضل دین کو خاصا ملول پایا۔ اس کی ملولیت میں پشیمانی اور ندامت بھی شامل تھی تاہم میں نے رشتے ٹوٹنے کے حوالے سے کوئی بات نہیں کی۔ یہ ان کا سراسر ذاتی اور خاندانی مسئلہ تھا اور پھر اس قسم کی باتوں کا یہ کوئی موقع بھی نہیں تھا۔

آنے والے چار پانچ روز میں کوئی پیش رفت نہ ہوئی۔ کرم دین مرحوم کے گھر ہونے والی چوری کے بارے میں کوئی امید افزا خبر ملی اور نہ ہی بوٹا ڈنگر چور کے سراغ کی اطلاع مجھ تک پہنچی۔ چنانچہ اس سلسلے میں، میں نے اپنی سرگرمیوں کو تیز تر کر دیا۔

یہ روایت کے خلاف تھا، میرا مطلب ہے محکمہ پولیس کی روایات کے خلاف۔ ہمارے محکمے میں عموماً یہ ہوتا ہے کہ جس کیس کے سلسلے میں پیش رفت نہ ہو اور تفتیش کی گاڑی کو کوئی مفید راستہ دکھائی نہ دے، اس کیس کی فائل دیگر بہت سی فائلوں کے نیچے دب کر رہ جاتی ہے جسے عرفِ عام ”داخل دفتر“ بھی کہا جاتا ہے۔

میری ہمیشہ سے یہ کوشش رہی ہے کہ عام روایتی طریقہ تفتیش سے ذرا ہٹ کر کام کروں۔ جن کیسز میں مجھے خاطر خواہ کامیابی ہاتھ نہیں آتی، میں ان کے سلسلے میں زیادہ تن دہی سے بھاگ دوڑ کرنے لگتا ہوں چنانچہ نامعلوم مفرور قاتلوں کی تلاش کے لیے میں نے کمر کس لی۔ اس مہم میں اے ایس آئی کامی شاہ بھی میرے ساتھ پوری طرح شریک تھا۔

دس روز کی تلاش بسیار کے بعد ہمیں موضع دولت پور میں پہلی کامیابی حاصل ہو گئی۔ ہم مقتول نامعلوم کا سراغ لگانے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ وہ نوجوان مقتول موضع دولت پور ہی کا باسی تھا۔ اس کی لاش کی تصویریں اور مکمل حلیہ ہمارے پاس موجود تھا لہٰذا ہمیں زیادہ دقت کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ میں نے پہلے بھی دولت پور میں مقتول کی تلاش کروائی تھی لیکن وہ کیا کہتے ہیں کہ کوئی کام خود کرنے اور کسی دوسرے سے کروانے میں زمین آسمان کا فرق ہوتا ہے۔

بدنصیب نوجوان مقتول اب نامعلوم نہیں رہا تھا۔ اس کا نام صفدر علی تھا۔ وہ گاؤں کے موچی خوشی محمد کا بیٹا تھا۔ ہم پوچھتے پاچھتے خوشی محمد کے گھر پہنچ گئے۔

وہ دوپہر کا وقت تھا اور خوشی محمد کھانا کھانے گھر آیا ہوا تھا۔ ہماری دستک کے جواب میں ایک نوعمر لڑکی نے دروازہ کھولا اور سوالیہ نظر سے ہمیں دیکھنے لگی۔ ہم اس وقت سادہ لباس میں تھے اس لیے لڑکی نے کسی غیر معمولی ردِعمل کا مظاہرہ نہیں کیا۔ اس لڑکی کی عمر گیارہ بارہ سال رہی ہو گی۔

میں نے نرم لہجے میں پوچھا ”بیٹی! ہم تمہارے باپ سے ملنے آئے ہیں۔ خوشی محمد کو باہر بھیجو۔“

”کون ہے رجو؟“ گھر کے اندرونی حصے سے کسی نے پوچھا۔

آواز مردانہ تھی لہٰذا وہ خوشی محمد بھی ہو سکتا تھا۔ لڑکی کو رجو کہہ کر مخاطب کیا گیا تھا جس کا واضح مطلب یہی تھا کہ اس کا نام رضیہ ہو گیا۔ بعد میں اس کی تصدیق بھی ہو گئی۔

رجو نامی لڑکی نے جواب دیا ”ابا! دو پروہنے (مہمان) آئے ہیں تم سے ملنے۔“

”کون ہیں یہ پروہنے؟“ خوشی محمد نے کہا ”انہیں اندر لے آؤ۔“

”ابا! پتا نہیں، کون ہیں“ رجو نے کہا ”یہ تمہیں باہر بلا رہے ہیں۔ میں نے انہیں پہلی بار دیکھا ہے۔“

خوشی محمد کی آواز آئی "اچھا' میں آرہا ہوں۔"
تھوڑی دیر بعد لڑکی کے پیچھے خوشی محمد کی جھلک دکھائی دی۔ اس کے ساتھ ہی ایک عورت بھی نظر آئی۔ غالباً وہ خوشی محمد کی بیوی تھی۔
"جی 'کیا کام ہے مجھ سے؟" خوشی محمد نے حیرت آمیز نظر سے باری باری ہم دونوں کا جائزہ لیا "میں نے آپ کو پہچانا نہیں؟"
میں نے کھنکار کر گلا صاف کرتے ہوئے کہا "خوشی محمد! تم ہمیں کس طرح پہچان سکتے ہو۔ ہم تو آج پہلی مرتبہ مل رہے ہیں۔"
"آپ مجھ سے ملنے کیوں آئے ہیں؟"
میں نے اس کے سوال کا جواب دینے کے بجائے الٹا سوال کردیا "کیا تمہارے گھر میں بیٹھنے کی کوئی جگہ نہیں ہے۔ یہاں دروازے پر کھڑے کھڑے تو بات نہیں ہوسکتی نا!"
"میں آپ کو گھر کے اندر کس طرح بلا سکتا ہوں" وہ قدرے اکھڑ لہجے میں بولا "آپ میرے لیے قطعی اجنبی ہیں۔ پہلے اپنا تعارف تو کروائیں۔"
اے ایس آئی نے خوشی محمد سے کہا "ہم لالیکا کے تھانے سے آئے ہیں۔"
پھر اس نے میری جانب اشارہ کرتے ہوئے بتایا "یہ ملک صفدر حیات تھانہ انچارج ہیں اور میں اے ایس آئی کامی شاہ!"
"اوہ' پولیس!" خوشی محمد نے طویل فکر آمیز سانس خارج کرتے ہوئے کہا۔
میں نے کہا "خوشی محمد! ہم تمہارے لیے ایک بری خبر لے کر آئے ہیں" ایک لمحے کے توقف سے میں نے سرسراتی ہوئی آواز میں اضافہ کیا "یہیں کھڑے کھڑے سنوگے یا گھر کے اندر جانے کی اجازت دوگے؟"
"ہائے میں مرگئی" خوشی محمد کے ساتھ کھڑی عورت نے بری خبر کے ذکر پر کہا۔
خوشی محمد راستے سے ہٹتے ہوئے بولا "آجائیں اندر۔ میں اتنے دکھ اٹھا چکا ہوں کہ بڑی سے بڑی بری خبر بھی نہ صرف سن سکتا ہوں بلکہ اسے برداشت بھی کرسکتا ہوں۔"
ایک منٹ بعد ہم خوشی محمد کی بیٹھک میں بیٹھے ہوئے تھے۔ خوشی محمد کی بیوی کا نام فردوس بیگم تھا۔ اس کی بے قراری دیدنی تھی۔ سب سے پہلے اسی نے سوال کیا۔
"تھانے دار صاحب! آپ لالیکا سے ہمارے لیے کون سی بری خبر لائے ہیں؟"
میں نے جواب دینے کے بجائے مقتول نوجوان کی تصویریں ان کی جانب بڑھادیں۔ تصویروں پر نگاہ پڑتے ہی فردوس بیگم چیخ اٹھی۔
"یہ تو اپنا صفدر ہے۔ کیا ہوا ہے اسے؟"
میں نے مختصر مگر جامع الفاظ میں انہیں بتایا کہ صفدر علی کے ساتھ "کیا کچھ" پیش آچکا تھا۔ میری بات ختم ہوتے ہی فردوس نے رونا پیٹنا شروع کردیا جب کہ خوشی محمد نے صرف ایک جملہ ادا کرکے صدماتی انداز میں گردن جھکالی تھی۔
"ایک نہ ایک دن تو یہ ہونا ہی تھا۔"
خوشی محمد کی بات میں خاصی گہرائی تھی جس سے ظاہر ہوتا تھا' وہ اپنے بیٹے سے خوش نہیں تھا۔ ہمیں دولت پور میں صفدر کے بارے میں جو معلومات حاصل ہوئی تھیں وہ خاصی ناخوش گوار تھیں۔ صفدر کسی اچھی شہرت کا حامل نہیں تھا۔ وہ چھوٹے موٹے جرائم میں ملوث پایا گیا تھا تاہم اس کا خاص جرم "چوری" تھا۔ وہ چوری کی کئی وارداتوں میں شامل رہا تھا۔ ایک دو مرتبہ پولیس کے ہتھے بھی چڑھ چکا تھا اور چھوٹی موٹی سزا بھی پاچکا تھا۔ یہ یقینی بات تھی کہ وہ اپنے بیٹے کے کرتوتوں سے آگاہ تھا۔ اسے ہر وقت یہ دھڑکا لگا رہتا ہوگا کہ صفدر کسی بڑی مصیبت میں گرفتار ہوسکتا ہے۔ صفدر کے ساتھ جو اندوہ ناک واقعہ پیش آیا تھا' اس سے بڑی مصیبت اور کوئی نہیں ہوسکتی تھی۔
میں نے خوشی محمد کو کریدتے ہوئے کہا "تمہیں کیسے معلوم تھا کہ ایک نہ ایک دن یہ ہونا ہی تھا؟"
"انسان کو اپنے مال کا بہ خوبی اندازہ ہوتا ہے" اس نے فلسفیانہ انداز میں کہا۔
میں نے پوچھا "گویا تم اپنے بیٹے کی "سرگرمیوں" سے پوری طرح واقف تھے؟"
اس نے اثبات میں سرہلانے پر اکتفا کیا۔
میں نے کہا "تمہارے بیٹے کی لاش اس وقت سرکاری اسپتال میں رکھی ہوئی ہے۔ وہ ہمیں جن حالات اور جس حالت میں دریائے ستلج کے کنارے جستی ٹرنک میں ٹھنسی ملی ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اسے اس کے ساتھی ہی نے قتل کیا ہوگا۔ وہی ساتھی جس کی مدد سے اس نے کرم دین کے گھر سے مذکورہ جستی ٹرنک چوری کیا تھا۔ کیا تم اس کے ساتھی کی نشان دہی کرسکتے ہو؟"
اس کے ساتھ ہی میں نے اسے حالات کی تفصیل سے آگاہ کردیا۔
وہ چند لمحے سوچنے کے بعد نفی میں سرہلاتے ہوئے بولا

"میں اس سلسلے میں آپ کی کوئی مدد نہیں کر سکتا تھانے دار صاحب!"

اس کا لہجہ دوٹوک اور بات کرنے کا انداز خاصا مضبوط تھا۔ میں پورے وثوق سے کہہ سکتا تھا کہ وہ دروغ گوئی سے کام نہیں لے رہا تھا۔

میں نے پوچھا "خوشی محمد! لالیکا میں پیش آنے واقعے کو کم و بیش پندرہ دن گزر چکے ہیں۔ اتنے ہی دنوں سے تمہارا بیٹا صفدر بھی گھر سے غائب تھا۔ تم نے اس کے غیاب کا کوئی نوٹس کیوں نہیں لیا؟"

"میں کیا نوٹس لیتا جناب!" وہ مجروح نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔

میں نے کہا "تمہیں چاہیے تھا کہ صفدر کو تلاش کرتے۔"

"میں اسے کہاں تلاش کرتا" وہ سادگی سے بولا "پہلے بھی وہ دو چار دن کے لیے گھر سے غائب ہو جاتا ہے اور خود ہی واپس بھی آجاتا ہے۔ میں نے سوچا' اس مرتبہ بھی وہ خود ہی آجائے گا۔"

"خوشی محمد!" میں نے قدرے سخت لہجے میں اسے مخاطب کیا "دو چار دن اور پورے پندرہ دن میں بہت فرق ہوتا ہے۔ تم تو اطمینان سے ہاتھ پر ہاتھ رکھے بیٹھے تھے۔"

وہ بے چارگی سے بولا "میں اور کر بھی کیا سکتا ہوں جناب! صفدر میری سنتا ہی کب تھا۔ میں نے ایک طرح سے اس سے قطع تعلق کر رکھا تھا۔"

میں خوشی محمد کی مجبوری کو اچھی طرح سمجھ رہا تھا۔ نافرمان اور بے راہ رو اولاد کا باپ بڑی اذیت میں مبتلا ہوتا ہے۔ وہ ایک ایسی نادیدہ تکلیف برداشت کرتا رہتا ہے جس کا کسی اور سے ذکر بھی نہیں کیا جا سکتا۔ ایسا باپ اپنی ناخلف اولاد کے خلاف کچھ نہیں کر سکتا سوائے اسے عاق کرنے کے۔ خوشی محمد تو ایسا کرنے سے بھی معذور تھا۔ اس بے چارے کے پاس زمین و جائداد کے نام پر کچھ بھی نہیں تھا۔ وہ اگر چاہتا بھی تو صفدر کو عاق نہیں کر سکتا تھا۔ اس نے بہ حالتِ مجبوری "لاتعلقی" کا راستہ اختیار کر لیا تھا۔

میں نے ایک مجبور اور بے کس باپ سے سوال کیا "خوشی محمد! ٹھیک ہے' تم اپنے بگڑے ہوئے بیٹے کے معاملات میں زیادہ دلچسپی نہیں لیتے تھے مگر تمہیں یہ تو معلوم ہی ہوگا کہ اس کا زیادہ اٹھنا بیٹھنا کن لوگوں میں تھا؟"

"میں اس کے کالے کرتوتوں سے زیادہ واسطہ نہیں رکھتا تھا جناب!" خوشی محمد نے دکھی لہجے میں کہا "مگر اتنا ضرور جانتا ہوں کہ صفدر کا زیادہ میل تال منظورے سے تھا۔"

"یہ منظورا کون ہے خوشی محمد!" میں نے پوچھا۔

وہ بیزاری سے بولا "صفدر ہی کی طرح کا ایک اوباش شخص ہے جناب!"

"منظورے سے کہاں ملاقات ہو سکتی ہے؟"

خوشی محمد نے منظورے کے گھر کا پتا بتایا اور کہا "مجھے نہیں یقین کہ وہ آپ کو گھر پر مل جائے۔ وہ اِدھر اُدھر آوارہ گھومتا رہتا ہے۔"

"اِدھر اُدھر کہاں؟"

"یہ تو آپ کو پوچھ پاچھ کر خود ہی پتا چلانا ہوگا" اس نے کہا "منظورا بہت ہی کمینہ فطرت اور بد ذات آدمی ہے۔ صفدر کو بگاڑنے میں بھی اسی کا ہاتھ ہے۔"

میں خوشی محمد اور اس کے اہل خانہ کے لیے ایک اندوہناک اور دل خراش خبر لے کر آیا تھا۔ یہ ایسا موقع نہیں تھا کہ میں اپنے سوالات سے انہیں مزید زچ کرتا۔ میں نے خوشی محمد کو صفدر کی لاش حاصل کرنے کا طریقہ کار بتایا اور دو چار ہمدردی کے کلمات ادا کر کے اس کے گھر سے اٹھ آیا۔

کامی شاہ نے مجھ سے پوچھا "ملک صاحب! منظورے کو کس طرح تلاش کیا جائے؟"

میں نے کہا "پہلے تو یہاں سے سیدھے اس کے گھر چلتے ہیں۔ اگر وہ خوشی محمد کے اندازے کے مطابق گھر پر نہ پایا گیا تو پھر کچھ اور سوچیں گے۔"

آدھے گھنٹے کے بعد خوشی محمد کا اندازہ درست ثابت ہو گیا۔

"اب کیا کریں ملک صاحب؟" کامی شاہ نے سوال کیا۔

میں نے جواب دیا "اب ہم چوہدری نظام دین کے پاس چلتے ہیں۔"

"چوہدری نظام دین!" کامی شاہ کے لہجے میں حیرت تھی "یہ کون شخصیت ہیں ملک صاحب!"

میں نے اپنی ذاتی معلومات کی روشنی میں بتایا "چوہدری نظام دین موضع دولت پور کا ایک بااثر شخص ہے۔ وہ چوہدریوں کے خاندان سے تعلق نہیں رکھتا تاہم اسے ہر قسم کے معاملات میں ٹانگ پھنسانے کا شوق ہے اس لیے بھی لوگ اسے چوہدری کہہ کر پکارتے ہیں۔ نام تو اس کا نظام دین ہے مگر چوہدری نظام دین مشہور ہو گیا ہے۔ وہ خاصا چلتا پرزہ قسم کا انسان ہے۔"

میری فراہم کردہ معلومات نے کامی شاہ کو ورطۂ حیرت میں ڈال دیا۔ وہ جوشیلے لہجے میں بولا "ملک صاحب! آپ کی

معلومات تو لالیکا سے باہر بھی بہت دور تک پھیلی ہوئی ہیں۔"

"معلومات رکھنا پڑتی ہیں چھوٹے شاہ جی!" میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

کامی شاہ نے پوچھا "کیا چوہدری نظام دین منظورے کے بارے میں جانتا ہوگا؟"

"مجھے تو پورا یقین ہے" میں نے کہا "اس سے مل کر دیکھ لیتے ہیں۔"

پندرہ منٹ بعد ہم چوہدری نظام دین کی کشادہ بیٹھک میں براجمان تھے۔ نظام دین غائبانہ طور پر مجھ سے متعارف تھا تاہم آج پہلی مرتبہ ہم بالمشافہ ملاقات کر رہے تھے۔

رسمی علیک سلیک کے بعد چوہدری نظام دین نے ہماری خاطر تواضع کے لیے احکام جاری کرنا شروع کر دیے۔ ہمارے ہزار منع کرنے کے باوجود بھی وہ باز نہ آیا اور پہلے اس نے ہمیں ٹھنڈا پلوایا پھر با قاعدہ کھانے کے لیے ضد کرنے لگا۔

میں نے کہا "چوہدری صاحب! کھانے کا تکلف رہنے دیں۔ ہم ایک چھوٹے سے کام کے لیے آپ کے پاس آئے ہیں۔ وہی ہو جائے تو بڑی بات ہے۔"

"کام چھوٹا ہو یا بڑا' میں اسے کرنے کی ہر ممکن کوشش کروں گا ملک صاحب!" وہ سینے پر ہاتھ مارتے ہوئے بولا "میں آپ کی فرض شناسی اور دیانت داری کو بڑی تفصیل سے جانتا ہوں۔ ایسے لوگوں کی مدد کرکے مجھے بہت زیادہ خوشی ہوتی ہے۔" ایک لمحے کو وہ سانس لینے کو رکا پھر بات جاری رکھتے ہوئے بولا "اور یہ تکلف والی آپ نے کیا بات کر دی۔ جناب! آپ کو معلوم نہیں' آپ میرے آئیڈیل پولیس افسر ہیں۔ پھر آپ آج پہلی مرتبہ میرے غریب خانے پر تشریف لائے ہیں۔ میں کھانا کھائے بغیر آپ کو جانے دوں تو میرا نام بھی چوہدری نظام دین نہیں .... اور جناب! یہ تو کھانے کا وقت بھی ہے۔"

اس کے بے حد اصرار پر ہمیں ہتھیار ڈالنا پڑے۔ کسی کے سچے خلوص کو ٹھکرانا بھی گناہِ صغیرہ ہے۔ انسان کو چھوٹے بڑے تمام گناہوں سے اجتناب برتنا چاہیے۔

کھانے کے دوران میں' ہم نے چوہدری نظام دین کو اپنی آمد کی غرض و غایت سے آگاہ کیا۔ وہ مقتول صفدر علی اور اس کے یار غار مطلوب منظورے کو بڑی اچھی طرح جانتا تھا۔ صفدر علی کے حسرت ناک انجام پر اس نے گہرے تاسف کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

"ملک صاحب! پتا نہیں' آج کل کے نوجوانوں کو ہو کیا گیا ہے۔ تعمیر کے بجائے تخریب میں ان کا زیادہ دھیان لگتا ہے۔ بہرحال' صفدر کے ساتھ بہت برا ہوا۔"

آج کل کے نوجوانوں سے آج کل کے بزرگ ہی پریشان نہیں ہیں بلکہ یہ حقیقت ہے کہ پہلے زمانے کے نوجوانوں سے اس زمانے کے بزرگ بھی شاکی تھے۔ زمانہ کوئی بھی ہو' انسان تو انسان ہی ہے۔ زمانہ انسانوں سے ہے اور انسان اپنی فطرت سے مجبور ہے۔ شر اور خیر کے ملے جلے پہلوؤں سے عبارت یہ حضرت انسان اپنی فطرت کا مظاہرہ کرنے سے نہیں چوکتا۔ زمانے کو برا نہیں کہنا چاہیے' اچھا برا تو انسان ہوتا ہے۔

میں نے کہا "صفدر کے ساتھ تو برا ہی ہونا تھا چوہدری صاحب! تاریک راہوں کا مسافر روشنی کی منزل تک کیسے پہنچ سکتا ہے۔"

"آپ ٹھیک کہتے ہیں ملک صاحب!" چوہدری نظام دین نے تائید کی۔

میں نے کہا "چوہدری صاحب! ساری بات تو ہم نے آپ کو بتادی ہے۔ اب یہ فرمائیں کہ منظورے سے ملاقات کس طرح ہوگی۔ صفدر کے باپ نے بتایا ہے کہ منظورے کے ساتھ صفدر کے گہرے روابط تھے اور وہی شخص صفدر کو بگاڑنے والا بھی ہے۔"

"صفدر کے باپ کا خیال بھی ٹھیک ہی ہے" نظام دین اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولا "منظورا بڑا بدقماش آدمی ہے۔"

"میں اس بدقماش سے فوراً ملنا چاہتا ہوں" میں نے کہا۔

نظام دین بولا "آپ مجھے صرف ایک گھنٹا دے دیں۔ اگر منظورا دولت پور میں ہوا تو میں اسے آپ کے سامنے پیش کردوں گا۔"

"بھئی' ایک گھنٹا تو بہت زیادہ ہے" میں نے کہا۔

چوہدری نظام دین نے کہا "جناب! یہ وقت تو میں احتیاطاً لے رہا ہوں اسے ڈھونڈنے کے لیے۔ یہ بھی ممکن ہے' وہ دس منٹ ہی میں دستیاب ہو جائے۔"

"چلو ٹھیک ہے بھئی!" میں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا "ہم ایک گھنٹا انتظار کرلیں گے۔"

پھر وہ ہم سے اجازت لے کر تھوڑی دیر کے لیے گھر سے باہر چلا گیا۔

چوہدری نظام دین کی واپسی آدھے گھنٹے بعد ہوئی تھی اور حوصلہ افزا خبر یہ تھی کہ وہ خالی ہاتھ نہیں آیا تھا۔ ہمارا مطلوبہ بندہ منظورا اس کے ساتھ تھا۔

"ملک صاحب! اگر پانچ منٹ بھی دیر ہو جاتی تو منظورے نے ہاتھ سے نکل جانا تھا۔" چوہدری نظام دین نے تیز لہجے میں کہا "یہ اللہ کا بندہ منڈی چشتیاں جانے کے لیے بس میں سوار ہونے ہی والا تھا۔"

"کیا یہ اللہ کا بندہ خیر سے منڈی چشتیاں جا رہا تھا؟" میں نے پوچھا۔

"جی ہاں' یہ وہاں خیر خیریت ہی سے جا رہا تھا۔"

"کیا آپ نے اسے ہماری آمد کے مقصد سے آگاہ کر دیا ہے؟"

نظام دین نے جواب دیا "بڑی تفصیل سے جناب' اور مجھے خوشی ہے کہ آپ کے لیے خاصی گرما گرم خبریں ہیں۔"

"وہ کیا بھئی؟" میں سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔

چوہدری نظام دین نے کہا "آپ خود ہی اس سے سوال جواب کر لیں۔ میں ذرا ٹھنڈے وغیرہ کا انتظام کرتا ہوں۔"

پھر وہ بیٹھک سے اٹھ کر گھر کے اندرونی حصے میں چلا گیا۔

میں منظورے کی جانب متوجہ ہو گیا۔ وہ پچیّس چھبیس سال کا ایک مضبوط کاٹھی والا شخص تھا۔ اس نے خاصی گنجان مونچھیں رکھ چھوڑی تھیں۔ چوہدری نظام دین اسے ہمارے بارے میں کافی کچھ بتا چکا تھا تاہم میں نے پھر بھی اسے صورت حال سے آگاہ کرنا ضروری سمجھا۔ جب میں ساری بات اس کے گوش گزار کر چکا تو میں نے پوچھا۔

"منظورے! ہمیں اس بندے کی تلاش ہے جو صفدر علی کے ساتھ جستی ٹرنک کی چوری میں ملوث تھا۔"

منظورے نے کہا "میرا خیال ہے' آپ اسی بندے پر صفدر کے قتل کا شبہ کر رہے ہیں؟"

"تمہارا خیال درست ہے" میں نے کہا "حالات وواقعات اس رخ پر سوچنے کی راہ ہموار کر رہے ہیں منظورے ... اور تم ہمیں بتاؤ گے کہ وہ نامعلوم متوقع قاتل کون ہے؟"

"میں ہی کیوں بتاؤں گا" وہ دبی آواز میں بولا "اس کی کوئی خاص وجہ ہے؟"

میں نے اس کے چہرے پر نگاہ جماتے ہوئے کہا "ہاں' ہے ایک خاص وجہ۔"

وہ خاموشی سے میری جانب دیکھتا رہا۔ اس کی نظر میں سوال واضح طور پر پڑھا جا سکتا تھا۔ اس دوران میں چوہدری نظام دین پستے بادام والا ٹھنڈا دودھ لے کر بیٹھک میں آ چکا تھا۔

میں نے منظورے کو مخاطب کرتے ہوئے کہا "سب سے خاص وجہ تو یہ ہے کہ صفدر زیادہ تر تمہارے ساتھ پایا جاتا تھا اور اس کے باپ موچی خوشی محمد کا یہ خیال ہے کہ اسے بگاڑنے میں بھی تمہارا ہی ہاتھ ہے اس کے معمولات اور سرگرمیوں کے بارے میں تم سے زیادہ اور کون جان سکتا ہے منظورے!"

"تھانے دار صاحب! خوشی محمد کے خیال سے تو میں اتفاق نہیں کروں گا" منظورے نے برا سا منہ بناتے ہوئے کہا "البتہ جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ صفدر کو میں نے بگاڑا ہے' اس میں ذرا بھی حقیقت نہیں۔ وہ میرے پاس بگڑا بگڑایا ہی آیا تھا" ایک لمحے کے توقف سے اس نے اضافہ کیا "جناب! میں تو کئی دن سے صفدر سے ملا ہی نہیں' اس کی سرگرمیوں کے بارے میں کیا بتا سکتا ہوں۔ آپ یقین مانیں' میں نہیں جانتا کہ وہ کس شخص کے ساتھ چوری کی واردات میں ملوث رہا ہے۔"

"میں نے تمہاری بات کا یقین کر لیا منظورے" میں نے بات کو صحیح رخ پر لاتے ہوئے کہا "ہم فرض کر لیتے ہیں کہ تم کرم دین کے گھر ہونے والی چوری کی واردات اور اس میں ملوث وارداتیوں کے بارے میں کچھ نہیں جانتے" ایک لمحے کا توقف کر کے میں نے اپنی بات کو جاری رکھا "تم فی الحال یہ بتاؤ' آخری مرتبہ تم نے متوفی صفدر علی کو کب اور کہاں دیکھا تھا اور اس بات کو کتنا عرصہ ہوا ہے؟"

وہ حساب لگانے کے بعد بولا "شاید پندرہ سولہ دن ہوئے ہیں۔"

"چوری کی واردات کو بھی کم و بیش اتنے ہی دن گزرے ہیں" میں نے کہا "تم دونوں کی آخری ملاقات کہاں ہوئی تھی' اب یہ بھی بتا دو۔"

"ہم یہیں دولت پور ہی میں ملے تھے۔"

"ملاقات میں کیا باتیں ہوئی تھیں؟" میں نے پوچھا۔

وہ بولا "بس عام سی باتیں .... جیسی روز مرہ کی ہوتی ہیں۔"

میں نے سوال کیا "اس نے تمہیں اپنے کسی خاص پروگرام سے آگاہ کیا تھا؟"

منظورے نے نفی میں جواب دیا۔

میں نے پوچھا "کوئی ایسا ذکر کیا ہو کہ وہ کچھ عرصے کے لیے دولت پور سے کہیں اور جا رہا ہے؟"

"جی بالکل نہیں" منظورا قطعیت سے بولا۔

میں نے تھوڑی دیر سوچنے کے بعد پوچھا "آخری

ملاقات سے پہلے صفدر تم سے روزانہ ملتا رہا تھا کیا؟"

"جی ہاں، ہم روزانہ ہی ملتے تھے۔"

"اس کی غیر حاضری سے تم تشویش میں مبتلا نہیں ہوئے؟"

"نہ جی" منظورے نے نفی میں گردن ہلائی "وہ پہلے بھی دو چار دن کے لیے غائب ہو جاتا تھا اس لیے بھی میں نے سمجھا، فکر کی کوئی بات نہیں ہے۔"

میں نے پوچھا "مجھے پتا چلا ہے کہ تمہاری طرح صفدر بھی چھوٹے موٹے جرائم میں ملوث رہا ہے؟"

جواب دینے سے پہلے منظورے نے کن انکھیوں سے چوہدری نظام دین کو دیکھا۔ چوہدری نے سرزنش کرنے والے انداز میں کہا۔

"دیکھ منظورے! ملک صفدر حیات صاحب کی میں بہت عزت کرتا ہوں۔ تم ان کے سامنے کسی غلط بیانی سے کام نہیں لینا ورنہ مجھ سے برا کوئی نہیں ہوگا۔ تم جانتے ہی ہو، میں کس قسم کا بندہ ہوں۔"

منظورے نے دونوں ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا "چوہدری صاحب! اگر آپ ملک صاحب کا احترام کرتے ہیں تو یہ میرے بھی مائی باپ ہیں۔ میں ان سے جھوٹ نہیں بولوں گا۔"

میں نے اس کی تسلی کے لیے کہا "میں یہاں تمہارے جرائم کا کھوج لگانے نہیں آیا منظورے، اس سلسلے میں تمہیں پریشان ہونے کی چنداں ضرورت نہیں ہے۔ میں تو صرف تمہارے توسط سے متوقع قاتل تک پہنچنا چاہتا ہوں۔"

وہ تامل کرتے ہوئے بولا "تھانے دار صاحب! سچی بات تو یہ ہے کہ ہم کبھی بھی کسی سنگین مجرم میں ملوث نہیں رہے۔ چھوٹی موٹی ہیرا پھیری کی بات دوسری ہے۔"

"شاباش!" میں نے سراہنے والے انداز میں کہا "مجھے خوشی ہوئی کہ تم نے دروغ گوئی کا سہارا نہیں لیا اور اس کے ساتھ ہی میں یہ بھی امید کرتا ہوں کہ اور بھی میں تم سے جو کچھ پوچھوں گا، اس کا تم ٹھیک ٹھیک جواب دو گے۔"

"ٹھیک ٹھیک کیسے نہیں بتائے گا جناب!" چوہدری نظام دین نے اسے تیز نظر سے گھورتے ہوئے کہا۔

منظورا سہم کر میری جانب دیکھنے لگا۔ میں نے ایک بات خاص طور پر محسوس کی تھی کہ چوہدری نظام دین کے سامنے منظورے کو دم مارنے کی جرأت نہیں تھی۔

میں نے منظورے کو مخاطب کرتے ہوئے کہا "آخری ملاقات والے دن یا اس سے پہلے تم نے صفدر کے ساتھ کن لوگوں کو دیکھا تھا؟"

"یہ بتانا تو بہت مشکل ہے جناب!" وہ الجھن زدہ لہجے میں بولا "میں کیا جانوں، وہ میرے علاوہ اور کس کس سے ملتا رہا ہوگا۔"

اپنی بات ختم کرتے ہی منظورے نے چہرے کے عضلات کو اس طرح سکیڑا جیسے اس کے ذہن میں کوئی خاص بات آگئی ہو۔ اس موقع پر میں نے جلدی سے کہا۔

"ہاں، ہاں۔ کہو، منظورے تم کیا کہنا چاہتے ہو؟"

"میرے ذہن میں ایک بات آئی ہے" وہ پُرخیال انداز میں بولا "پتا نہیں، یہ آپ کے لیے اہم بھی ہے یا نہیں۔"

میں نے اضطراری لہجے میں کہا "اہم اور غیر اہم کا فیصلہ میں خود کرلوں گا منظورے۔ تم بات بتاؤ۔"

"بات دراصل یہ ہے جناب کہ صفدر سے آخری ملاقات کے روز میں نے اس کے ساتھ ایک اجنبی شخص کو بھی دیکھا تھا" منظورا معتدل لہجے میں بولا۔

"کون اجنبی شخص؟" میں نے تیز آواز میں دریافت کیا۔

وہ بولا "جناب! اجنبی تو اجنبی ہی ہوتا ہے۔ میں اس کے بارے میں آپ کو کیا بتا سکتا ہوں۔"

"صفدر نے اس اجنبی کا تعارف نہیں کروایا تھا؟"

اس نے جواب دیا "صفدر نے اس شخص کے بارے میں سرسری سا بتایا تھا۔"

"مثلاً کیا بتایا تھا؟" میں نے پوچھا۔

"مثلاً یہی کہ وہ شخص صفدر کا کوئی مہمان تھا جو ہارون آباد سے آیا تھا۔" منظورے نے بتایا۔

مہمان کے ذکر پر میں چونکا۔ خوشی محمد سے گفتگو کے دوران میں کسی مہمان کا تذکرہ نہیں ہوا تھا۔ اسی بات کو مدِ نظر رکھتے ہوئے میں نے منظورے سے کہا۔

"اگر وہ شخص صفدر کا مہمان تھا تو خوشی محمد اس سے بے خبر کیوں ہے؟"

"ہوسکتا ہے، صفدر نے ہارون آباد والے مہمان کے بارے میں اپنے گھر والوں کو کچھ نہ بتایا ہو" منظورے نے خیال آرائی کی۔

ایسا ممکن تھا۔ میں ہارون آبادی مہمان کی حقیقت جاننے کے لیے بے چین ہوگیا۔ وہ ایک ایسا پراسرار شخص ثابت ہو رہا تھا جس کے بارے میں نہ تو صفدر کا یار غار منظورا کچھ جانتا تھا اور نہ ہی مقتول صفدر کا باپ خوشی محمد اس سے واقف تھا۔ یہ پراسرار شخص میری نظر میں بہت اہم ہوگیا

تھا۔

میں نے اپنے سامنے بیٹھے ہوئے منظورے سے سوال کیا "اس اجنبی ہارون آبادی مہمان کا کوئی نام بھی تو ہوگا۔ تم نے اسی کا نام نہیں بتایا؟"

"نہ صفدر نے مجھے بتایا اور نہ ہی میں آپ کو بتا سکتا ہوں" منظورے نے کہا "ویسے آپ کی یہ بات ٹھیک ہی ہے کہ اس کا کوئی نہ کوئی نام ضرور ہوگا۔"

میں نے کہا "میں اسے بھی ڈھونڈ لوں گا اور اس کا نام بھی جان لوں گا لیکن تم صرف اتنا کرو کہ اس مہمان کا تفصیلی حلیہ مجھے بتادو؟" ایک لمحے کے توقف سے میں نے پوچھا "اب یہ تو نہیں کہو گے کہ تمہیں اس کا حلیہ بھی یاد نہیں رہا؟"

منظورا اپنا سینہ ٹھونکتے ہوئے بولا "تھانے دار صاحب! اللہ کے فضل سے میرا مشاہدہ اور حافظہ دونوں بہت طاقت ور ہیں اور اس کی وجہ یہ ہے کہ میں برکت پہلوان کی ہدایت کے مطابق پچھلے پانچ سال سے نہایت پابندی کے ساتھ دیسی بادام استعمال کر رہا ہوں۔"

اس کے بعد وہ دس پندرہ منٹ تک باداموں کے مختلف طریقۂ استعمال کے بارے میں ہمیں بتاتا رہا۔ جب اس کی عالمانہ گفتگو ختم ہوئی تو میں نے زیر لب مسکراتے ہوئے کہا۔

"اب ذرا اجنبی مہمان کا حلیہ نوٹ کروادو۔"

میں اپنی جیب سے قلم اور نوٹ بک پہلے ہی نکال چکا تھا۔ منظورے نے چند لمحے سوچا پھر بولنا شروع کردیا "اجنبی مہمان کا قد زیادہ نہیں تھا۔ پانچ فٹ، تین چار انچ ہوگا، گھنگریالے بال۔ عمر تیئس چوبیس سال، رنگ سانولا، دائیں آنکھ کے نیچے ایک ڈیڑھ انچ زخم کا نشان، مینوال ٹائپ مونچھیں اور..." وہ ذہن پر زور دینے کے بعد بولا "اور اس کے ایک ہاتھ کی انگلی میں چاندی کی انگوٹھی تھی جس میں قمیص کے بٹن جتنا فیروزہ جڑا ہوا تھا۔"

"کون سے ہاتھ کی انگلی میں انگوٹھی تھی؟" میں نے سوال کیا۔

وہ کھٹ سے بولا "بائیں ہاتھ کی انگلی میں جناب!"

"حیرت انگیز!" اے ایس آئی کامی شاہ نے بہ آواز بلند کیا۔

میں نے پوچھا "شاہ جی! آپ کو کس بات پر حیرت ہو رہی ہے؟"

"منظورے کی یادداشت اور قوتِ مشاہدہ پر۔"

"ہاں بھئی، بات تو حیرت ہی کی ہے" میں نے عام سے لہجے میں کہا "مگر شاید تم ایک بات بھول رہے ہو" پھر میں نے خود ہی وضاحت کردی "منظورا بتا چکا ہے کہ وہ کسی پہلوان کے مشورے پر ایک طویل عرصے سے بادام کھا رہا ہے۔"

کامی شاہ متذبذب انداز میں بولا "پھر بھی جناب، کیا بادام کھانے سے...؟"

میں نے اس کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی کہا "بالکل، بادام کھانے سے حافظہ، مشاہدہ اور یادداشت میقل ہو جاتے ہیں۔ ویسے بھی اب تمہاری ہنرمندی کا امتحان شروع ہونے والا ہے، چاہو تو تم بھی باداموں کا استعمال شروع کردو۔"

"میری ہنرمندی کا امتحان؟" کامی شاہ نے کچھ نہ سمجھنے والے انداز میں کہا۔

"ہاں برخوردار!" میں نے نوٹ بک میں درج اجنبی مہمان کے حلیے کی تفصیل کا جائزہ لیتے ہوئے کہا "واپس لاہور جاکر تم نے اس حلیے کا اسکیچ بنانا ہے۔ میں بھی تو دیکھوں کہ آرٹ میں تم کس مقام پر کھڑے ہو۔"

جب بات کامی شاہ کی سمجھ میں آگئی تو خوش دلی سے بولا "ضرور ملک صاحب! میں اس امتحان کے لیے پوری طرح تیار ہوں۔"

مزید آدھا گھنٹا دولت پور میں رکنے کے بعد ہم واپس آگئے۔

دوسرے روز کامی شاہ اپنے "کام" میں مصروف ہوگیا چھ گھنٹے کی محنت شاقہ کے بعد وہ آٹھ ضرب دس انچ کا ایک خاکہ تیار کرنے میں کامیاب ہوگیا۔ میں نے نوٹ بک میں درج اجنبی مہمان کے حلیے کی جزئیات سے قلمی خاکے موازنہ کیا تو کامی شاہ کے فن کا معترف ہونا پڑا۔ وہ واقعی ایک آرٹسٹ تھا۔ میرا خیال ہے اگر منظورے کے مشاہدے اور حافظے نے اسے دھوکا نہیں دیا تھا تو شاید اجنبی مہمان بھی کامی شاہ کے بنائے ہوئے اسکیچ کو دیکھ کر اش اش کر اٹھتا۔

میں کافی دیر تک نامعلوم متوقع قاتل کے اسکیچ کو دیکھتا رہا پھر اسے میز پر رکھ دیا اور گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ چند لمحات کے بعد کامی شاہ نے پوچھا۔

"ملک صاحب! ہارون آباد تو بہت بڑا علاقہ ہے۔ ہم اس بندے کو کہاں کہاں تلاش کرتے پھریں گے؟"

میں نے کہا "تم بالکل ٹھیک کہہ رہے ہو کامی شاہ۔ اس کی تلاش کے لیے ہم ایک خاص قسم کا لائحہ عمل تیار کرنا ہوگا۔"

"اور پھر یہ بھی کوئی ضروری نہیں ہے کہ اس بندے کا

تعلق ہارون آباد ہی سے ہو۔" وہ بولا "ممکن ہے، مقتول نے منظورے کو ٹالنے کے لیے یہ کہہ دیا ہو۔"

میں نے کہا "ہاں، ایسا ہو سکتا ہے...." اسی وقت میرے ذہن میں ایک خیال بجلی کے کوندے کے مانند چمکا۔ میں بولتے بولتے یک دم خاموش ہو گیا۔

میری سنجیدگی کو دیکھتے ہوئے کامی شاہ نے پوچھا "کوئی خاص بات ہے ملک صاحب! آپ گہری سوچ میں ڈوب گئے ہیں۔"

"ہاں، بہت خاص بات ہے" میں نے جواب دیا "میرے ذہن میں آئیڈیا آیا ہے۔"

"کیسا آئیڈیا؟" وہ ہمہ تن گوش ہو گیا۔

میں نے کہا "ہم مطلوبہ بندے کی تلاش کے لیے زینت بی بی سے بھی مدد لے سکتے ہیں۔"

"زینت بی بی!" کامی شاہ نے زیرِ لب دہرایا "آپ کا مطلب ہے، کرم دین عرف کرمو کی بیوی؟"

میں نے اثبات میں جواب دیا۔ اس نے پوچھا "زینت ہماری کیا مدد کر سکتی ہے ملک صاحب!"

میں نے سمجھانے والے انداز میں کہا "دیکھو کامی شاہ! زینت کی بہن اور بہنوئی ہارون آباد میں رہتے ہیں لہٰذا زینت بھی وہاں آتی جاتی رہتی ہو گی۔ ممکن ہے کوئی صورت نکل ہی آئے۔"

کامی شاہ نے کہا "ٹرائی کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے مگر مجھے کامیابی کے زیادہ امکانات نظر نہیں آ رہے۔"

میں نے کہا "زینت نے بتایا تھا کہ اس کے بہن بہنوئی ہارون آباد کے علاقے کوٹ حضور سنگھ میں رہتے ہیں۔ اس تلاش کے سلسلے میں ان سے بھی ملا جا سکتا ہے۔"

"چلیں، کوشش کرتے ہیں" وہ اتفاق کرتے ہوئے بولا۔

عصر سے ذرا پہلے ہم دونوں ایک مرتبہ پھر مرحوم کرم دین کے گھر میں بیٹھے زینت سے گفت و شنید کر رہے تھے۔ رسمی علیک سلیک کے بعد زینت نے پوچھا۔

"تھانے دار صاحب! ہمارے ٹرنک کا کچھ پتا چلا؟"

"میں تمہارے مسروقہ جستی ٹرنک کو ڈھونڈنے کے لیے ہی بھاگ دوڑ کر رہا ہوں۔ زینت اور اس سلسلے میں مجھے کچھ کامیابی بھی ہوئی ہے" میں نے گول مول الفاظ میں کہا۔ دراصل میں زینت کو اپنی کارکردگی کے بارے میں فی الحال کھل کر بتانا نہیں چاہتا تھا۔

یہ ہمارا ایک خاص طریقہ کار ہوتا ہے۔ اپنی کوششوں اور ان کے نتیجے میں حاصل ہونے والی قیمتی معلومات کو ہم اپنے تک ہی رکھتے ہیں اور جب تک کوئی انتہائی ضرورت درپیش نہ ہو، ان معلومات میں کسی کو شریک نہیں کرتے۔

زینت میری حوصلہ بخش بات سننے کے بعد دعائیہ انداز میں بولی "اللہ کرے، جلد از جلد وہ ٹرنک مجھے مل جائے۔ اب تو نگو کی شادی بالکل سر پر آ گئی ہے۔"

"نگو کی شادی!" میں نے چونکتے ہوئے لہجے میں کہا۔

"ہاں تھانے دار صاحب! میں نے اس کی تاریخ طے کر دی ہے" زینت نے بتایا "ایک ماہ بعد اس کی شادی ہو جائے گی۔ بس میں کرم دین کے چالیسویں کا انتظار کر رہی ہوں۔"

میں نے پوچھا "کہاں کر رہی ہو، بیٹی کی شادی؟"

وہ ایک ٹھنڈی آہ خارج کرتے ہوئے بولی "تھانے دار صاحب! مشکل میں ہمیشہ اپنے ہی کام آتے ہیں۔ میں ساری زندگی کرم دین کو یہ بات سمجھاتی رہی مگر اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ وہ اپنے لالچی بھائی فضل دین کو اپنا سمجھتا رہا مگر مصیبت کے وقت اس کی اصلیت کھل گئی۔ اس نے ہماری بیٹی کے رشتے سے انکار کر دیا جبکہ..." وہ ایک لمحے کو سانس لینے کے لیے رکی پھر بات جاری رکھتے ہوئے بولی "جبکہ میری بہن واقعی میری سچی ہمدرد ہے۔ اس نے اس کس مپرسی کی حالت میں بھی میری بیٹی کو اپنی بیٹی بنانے کا اعلان کر دیا۔ میں نے اپنی خواہش کے مطابق نگو کی شادی اپنے بھانجے نادر علی سے کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ کتنے فراخ دل اور اعلیٰ ظرف ہیں میرے بہن بہنوئی۔ انہوں نے ایک تنکا بھی جہیز کے نام نہیں مانگا۔"

زینت نے جو کہانی سنائی تھی، اس کے روشن امکانات موجود تھے۔ کرم دین کی ضد کی وجہ سے نگو کی شادی اس کے تایا زاد قادر بخش سے ہونے جا رہی تھی ورنہ زینت کا تو پورا زور اپنے بھانجے نادر علی کی طرف تھا جس کی مخالفت کرم دین کر رہا تھا۔ مخالفت کرنے والا اب اس دنیا میں نہیں رہا تھا لہٰذا زینت کو اپنی من مانی کرنے سے کوئی نہیں روک سکتا تھا۔

سچ کہتے ہیں، سارے جھگڑے زندگی تک ہوتے ہیں۔ مرنے کے بعد کوئی مسئلہ باقی نہیں رہتا۔ یہ اچھی بات تھی کہ نادر علی کے والدین نے جہیز وغیرہ کا مطالبہ نہیں کیا تھا ورنہ زینت کے لیے بہت سی مشکلات کھڑی ہو جاتیں۔

میں نے کہا "زینت بی بی! تمہاری بہن تو ہارون آباد میں رہتی ہے نا؟"

اس نے اثبات میں جواب دیتے ہوئے بتایا "ہاں

تھانے دار صاحب! فضیلت بی بی ہارون آباد کے علاقے موضع کوٹ حضور سنگھ میں رہتی ہے۔"

"تمہارا بہنوئی کیا کرتا ہے؟"

"عاشق علی ترکھان ہے" اس نے بتایا "وہیں گاؤں میں اس کی دکان ہے۔"

میں نے کہا "تم مجھے اپنے بہنوئی عاشق علی کا پتا اچھی طرح لکھوادو۔ دو چار دن بعد میں کسی سرکاری کام سے ہارون آباد جانے والا ہوں۔ اگر وقت ملا تو عاشق علی سے بھی ملاقات کروں گا۔ ایسے ہمدرد اور نیک دل انسان سے مل کر مجھے خوشی ہوگی۔"

اس نے کوٹ حضور سنگھ میں عاشق علی کے گھر اور دکان کا پتا تفصیلاً مجھے نوٹ کروادیا پھر پوچھا "آپ کس سلسلے میں ہارون آباد جارہے ہیں؟"

میں نے کہا "ہے ایک محکمہ جاتی کام۔ ایک بندے کا سراغ لگانا ہے۔"

وہ دلچسپی لیتے ہوئے بولی "کیا کسی مجرم کا سراغ لگانا ہے؟"

"ہاں، ایسی ہی بات ہے" میں نے کہا "دراصل بات یہ ہے کہ مجھے ایک قاتل کی تلاش ہے۔ اب تک کی تفتیش سے یہ بات سامنے آئی ہے کہ قاتل کا تعلق ہارون آباد سے ہے۔ میں اسی سلسلے میں وہاں جارہا ہوں۔"

وہ کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے بولی "جناب، کوٹ حضور سنگھ میں تو سب امن پسند اور صلح جو لوگ رہتے ہیں۔ مجھے نہیں امید کہ آپ کا مطلوبہ قاتل وہاں مل سکے۔"

میں نے کہا "میں تو پورے ہارون آباد کو ہی چھانوں گا۔ کہیں نہ کہیں تو کوئی اسے جاننے والا مل ہی جائے گا۔"

زینت کی دلچسپی گہری ہوگئی۔ اس نے گہری سنجیدگی سے پوچھا "آپ کو جس آدمی کی تلاش ہے تھانے دار صاحب، اس کا نام کیا ہے؟"

"اس کا نام ابھی معلوم نہیں ہوسکا۔"

"پھر تو آپ کے لیے بڑی مشکل ہوجائے گی؟"

"ہاں، مشکل تو ہوگی" میں نے کہا "شاید اس کی تصویر سے بات بن جائے۔"

زینت نے پوچھا "کیا آپ کے پاس اس قاتل کی تصویر بھی ہے؟"

"اندازوں سے بنوائی ہے میں نے ایک تصویر" میں نے کہا "بلکہ وہ ایک قلمی خاکہ ہے جو مطلوبہ قاتل کے معلومہ حلیے کے مطابق تیار کروایا گیا ہے۔"

"کیا وہ خاکہ آپ مجھے دکھاسکتے ہیں؟" زینت نے اچانک پوچھا۔

ایک لمحے کو میں نے سوچا پھر وہ اسکیچ زینت کو دکھانے کا فیصلہ کرلیا۔ میں زینت کے مسروقہ جستی ٹرنک کی تلاش کے سلسلے ہی میں قاتل کو ڈھونڈتا پھر رہا تھا۔ گویا زینت اس کیس کی ایک متعلقہ فرد تھی لہٰذا اسے خاکہ دکھانے میں مجھے کوئی قباحت محسوس نہیں ہوئی۔

میں نے کہا "ہاں، میں وہ خاکہ تمہیں دکھاسکتا ہوں" پھر اپنی جیب میں سے کامی شاہ کا تخلیق کردہ وہ خاکہ نکال لیا۔ میں نے مذکورہ خاکے کو چار تہ کرر کھا تھا۔ کاغذ کی تہیں کھول کر میں نے وہ خاکہ زینت بی بی کی جانب بڑھادیا۔

مطلوبہ قاتل کے خاکے پر نظر پڑتے ہی زینت اس طرح اچھلی جیسے اس نے بجلی کے ننگے تار کو چھولیا ہو۔ میں نے تیزی سے بدلتے اس کے چہرے کے تاثرات سے اندازہ لگالیا کہ وہ اس شخص کو بہ خوبی پہچان گئی تھی۔

میں نے قدرے سخت لہجے میں پوچھا "تم جانتی ہو اس شخص کو۔"

وہ نفی میں گردن جھٹکتے ہوئے بولی "نن... نہیں... یہ قاتل نہیں ہوسکتا۔"

"یہ میرے سوال کا جواب نہیں ہے" میں نے تیز آواز میں کہا "یہ شخص قاتل ہے یا شاہد؟ یہ فیصلہ کرنا میرا کام ہے۔ تمہاری حالت کو دیکھتے ہوئے میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ تم اس شخص کو اچھی طرح جانتی ہو۔ جو چیزیں اس خاکے میں نظر نہیں آرہیں وہ میں تمہیں زبانی بتادیتا ہوں" ایک لمحے کا توقف کرکے میں نے سنسناتے ہوئے لہجے میں اضافہ کیا "اس شخص کا رنگ سانولا ہے، قد لگ بھگ سوا پانچ فٹ اور یہ اپنے بائیں ہاتھ کی ایک انگلی میں چاندی کی انگوٹھی پہنتا ہے جس میں فیروزہ جڑا ہوا ہے۔ اب تم مجھے بتاؤ گی کہ یہ شخص کون ہے، اس کا نام کیا ہے اور کہاں پایا جاسکتا ہے؟"

وہ میرے اتنے سوالوں سے گھبراگئی تاہم گھبراہٹ سے زیادہ پریشانی اور تشویش نے اسے جکڑ رکھا تھا۔ جب وہ گویا ہوئی تو اس کی آواز میں نقاہت بڑی واضح تھی۔ اس نے شکستہ لہجے میں بتایا۔

"یہ... یہ تو... اپنا نادر علی ہے۔"

"نادر علی!" اب میرے اچھلنے کی باری تھی "یعنی تمہارا لاڈلا بھانجا نادر علی؟"

"ہاں، یہ ہوبہو اس کی تصویر ہے" وہ لرزاں لہجے میں بولی۔

کامی شاہ نے معنی خیز نظر سے میری جانب دیکھتے ہوئے کہا "لو جی ملک صاحب! سارا مسئلہ ہی حل ہو گیا۔"

زینت نے سراسیمہ لہجے میں دریافت کیا "نادر نے کس کو قتل کیا ہے؟"

"صفدر علی کو" میں نے بتایا۔

وہ مستفسر ہوئی "یہ صفدر علی کون ہے؟"

"کیا تم صفدر کو نہیں جانتی ہو؟"

"نہیں، بالکل نہیں" وہ قطعیت سے بولی۔

اب ضروری ہو گیا تھا کہ زینت کو تفصیل سے آگاہ کیا جاتا۔ میں نے کہا "زینت بی بی! تمہارے گھر سے جستی ٹرنک چرانے والے دو افراد میں سے ایک کی لاش ہمیں اسی جستی ٹرنک کے اندر بند دریا کے کنارے پڑی ملی تھی۔ صفدر علی اسی مقتول کا نام ہے۔ وہ موضع دولت پور کا رہنے والا تھا۔"

"مگر میرے بھانجے نادر علی کا صفدر سے کیا تعلق ہے؟" زینت نے پوچھا۔

میں نے کہا "بہت گہرا تعلق ہے۔ نادر علی، مقتول صفدر کا گہرا دوست تھا۔"

زینت کے چہرے پر الجھن آمیز حیرت کے بادل منڈلا رہے تھے۔ اس نے بے یقینی کے انداز میں پوچھا "اگر صفدر سے میرے بھانجے کا یارانہ تھا تو نادر علی نے اسے قتل کیوں کیا۔ یہ بات میری سمجھ میں نہیں آ رہی۔"

"تمہارے اس سوال کا جواب تو نادر علی ہی دے سکتا ہے" میں نے کہا "ہاں، اتنا جان لو کہ نادر علی کسی بہت بڑی مصیبت میں گرفتار ہونے والا ہے۔ مجھے بڑی حد تک شبہ ہے کہ جستی ٹرنک کی چوری میں صفدر کا ساتھی نادر علی ہی تھا۔"

وہ شدت سے نفی میں گردن جھٹکتے ہوئے بولی "یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ نادر علی کو اپنی ماسی (خالہ) کے گھر میں چوری کرنے کی کیا ضرورت تھی؟"

"پہلے سوال کی طرح تمہارے اس سوال کا جواب بھی نادر علی ہی دے گا" میں نے کہا۔

"ہائے اللہ' یہ کیا ہو رہا ہے" وہ آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے التجائیہ انداز میں کراہی "پہلے ہمارے گھر سے قیمتی سازوسامان والا ٹرنک چوری ہوا' پھر نگو کا رشتہ ٹوٹا اور اب ....اور اب میرے بھانجے پر مصیبت آن پڑی ہے" ایک لمحے کو رک کر وہ منت آمیز لہجے میں مجھ سے کہنے لگی "تھانے دار صاحب! آپ یقین کریں' نادر علی اس طرح کا کام نہیں کر سکتا۔ وہ تو بڑا ہی بابندہ ہے۔ آپ کو یقیناً کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔"

میں نے اٹھتے ہوئے کہا "میں کسی غلط فہمی یا خوش فہمی میں مبتلا نہیں ہوں۔ حالات مجھے جس رخ پر ڈال رہے ہیں' میں ادھر ہی جا رہا ہوں۔ اب ہارون آباد میں تمہارے بھانجے سے ملاقات بہت ضروری ہو گئی ہے۔"

"پتا نہیں' میری نگو کی قسمت اتنی خراب کیوں ہے؟" وہ اپنی پیشانی کو پیٹتے ہوئے بولی "اب ایک مرتبہ پھر اس کی شادی کھٹائی میں پڑنے والی ہے۔"

اسی وقت نگہت پروین عرف نگو گھر میں داخل ہوئی۔ وہ کافی دیر سے اپنی کسی سہیلی سے ملنے دوسری گلی کے ایک گھر گئی ہوئی تھی۔ مجھے امید تھی کہ زینت نے نگو کو تازہ ترین تکلیف دہ صورت حالات سے آگاہ کرنا تھا۔ میں اس جذباتی اور غم زدہ فضا میں نہیں رہنا چاہتا تھا اس لیے کامی شاہ کے ساتھ مرحوم کرم دین کے گھر سے نکل آیا۔

باہر آ کر کامی شاہ نے مجھ سے پوچھا "اس گھر پر تو پے در پے آفات نازل ہو رہی ہیں ملک صاحب! آخر ان کا قصور کیا ہے؟"

میں نے سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا "اب بہت کم وقت باقی رہ گیا ہے۔ قصوروار اور بے قصور کا فیصلہ ہونے ہی والا ہے۔ ویسے تمہارے اس خیال سے میں بھی اتفاق کرتا ہوں کہ اس گھر کو کسی نامراد کی نظرِ بد لگ گئی ہے۔"

"اب ہم تھانے جا رہے ہیں نا" کامی شاہ نے سوال کیا۔

میں نے جواب دیا "ہاں' فی الحال تو تھانے جانا ہی پڑے گا۔"

"فی الحال.... میں سمجھا نہیں۔"

"نادر علی کی گرفتاری کا بندوبست کرنا ہے" میں نے کہا "اس کے لیے تھانے جانا ضروری ہے۔"

کامی شاہ نے پوچھا "تو کیا ہم ابھی ہارون آباد کی طرف ...!"

"ہاں۔" میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا "ہمیں فوری طور پر روانہ ہونا ہوگا۔ زینت صورتِ حال کی سنگینی سے آگاہ ہو چکی ہے۔ اگر وہ ہم سے پہلے وہاں پہنچ گئی یا کسی طرح اس نے کوئی اطلاع ہی ادھر پہنچا دی تو ہم ہاتھ ملتے رہ جائیں گے۔ نادر علی ہمارے ہاتھ سے نکل جائے گا" میں نے ذرا رک کر کہا "ویسے مجھے امید ہے' زینت بی بی صبح سے پہلے کوئی پیش رفت نہیں کرے گی اس لیے ہمیں رات ہی کو اپنا کام مکمل کر لینا چاہیے۔"

کامی شاہ نے بھی میرے منصوبے سے اتفاق کیا اور ہم تھانے کا چکر لگانے کے بعد پہلے بہاول نگر ریلوے اسٹیشن پہنچے اور پھر ٹرین میں بیٹھ کر ہارون آباد کی جانب روانہ ہوگئے۔ یہ ایک اتفاق ہی تھا کہ جس وقت ہم ریلوے اسٹیشن پہنچے ایک ٹرین ہماری منزل کی طرف جانے کے لیے تیار کھڑی تھی۔ ہارون آباد اور بہاول نگر کے درمیان صرف ایک چھوٹا سا اسٹیشن تھا' یہ موضع ڈنگا بنگا کا اسٹاپ تھا۔ ہارون آباد سے آگے ٹرین فقیروالی سے ہوتے ہوئے فورٹ عباس کی جانب چلی جاتی تھی۔

جب ہم ہارون آباد کے اسٹیشن پر اترے تو مغرب کی اذان ہو رہی تھی۔ وہ گرمیوں کا موسم اور جولائی کا مہینا تھا۔ دن خاصا طویل ہوتا تھا۔ غروب آفتاب لگ بھگ سوا سات' ساڑھے سات بجے ہوتا تھا۔ ہم نے اسٹیشن سے باہر آکر ایک سالم تانگا کیا اور کوٹ حضور سنگھ کی جانب روانہ ہوگئے۔

موضع کوٹ حضور سنگھ میں داخل ہوں تو پہلے عاشق علی ترکھان کی دکان آتی تھی۔ اس سے کچھ فاصلے پر اس کا گھر تھا۔ دکان چونکہ بند ہو چکی تھی اس لیے ہم نے تانگے سے اتر کر اس کے گھر کا رخ کیا۔ تانگے والے کو ہم نے احتیاطاً روک لیا تھا۔ وہاں کسی بھی قسم کی ایمرجنسی پیش آسکتی تھی۔ اس وقت ہم پولیس کی مروجہ یونی فارم میں تھے اور یہ بتانے کی ضرورت نہیں ہے کہ نادر علی کے گھر کا رخ کرنے سے پہلے میں نے اس علاقے سے متعلقہ تھانے میں بھرپور "انٹری" ڈال دی تھی۔ اس تھانے کے انچارج نے اپنا ایک کانسٹیبل ہمارے ہم راہ کر دیا تھا۔

ہماری دستک کے جواب میں جس شخص نے دروازہ کھولا۔ وہ کامی شاہ کے بنائے ہوئے اسکیچ پر پندرہ آنے فٹ بیٹھتا تھا۔ میں نے گھور کر اسے دیکھا اور پوچھا "تم نادر علی ہو؟"

پولیس کی وردی میں ملبوس دو افراد کو سامنے کھڑے دیکھ کر وہ حواس باختہ ہو چکا تھا۔ میرے کڑے سوال نے اسے مزید بوکھلاہٹ میں مبتلا کر دیا۔ جواب دینے کے بجائے اس نے جلدی سے دروازہ بند کرنے کی کوشش کی لیکن میں اس کی طرف سے غافل نہیں تھا۔

میں نے اپنا دایاں پاؤں دروازے کے دونوں پٹ کے درمیان پھنسا دیا اور نادر علی پر ہاتھ ڈالنے کی کوشش کی۔ میری اس کوشش کے ردِعمل کے طور پر وہ پیچھے کو اچھلا اور ایک ادھیڑ عمر شخص سے ٹکرا گیا جو اسی لمحے وہاں نمودار ہوا تھا۔ ظاہر ہے' وہ گھر کے اندرونی حصے سے برآمد ہوا تھا۔

"بچ کر نہ جائے کامی شاہ!" میں نے بہ آواز بلند اے ایس آئی کو حکم جاری کیا۔

دراصل اس وقت میرے اور نادر علی کے درمیان وہ شخص زمین پر گرا پڑا تھا جو نادر علی کے ٹکراؤ سے متاثر ہوا تھا۔ کامی شاہ نے کسی چیتے کے مانند جست بھری اور چند قدموں کے فاصلے پر نادر علی کو دبوچ لیا۔ میں بھی زمین بوس ادھیڑ عمر شخص کو پھلانگ کر نادر علی کے سر پر پہنچ گیا۔ ہمارا ہمراہی کانسٹیبل بھی اندر آگیا۔ اس کا نام اسماعیل تھا۔

وہ خود کو کامی شاہ کی گرفت سے چھڑانے کے لیے ہاتھ پاؤں مار رہا تھا۔ میں نے لگاتار اس کے منہ پر تین چار تھپڑ رسید کیے پھر اس کے فرار کی کوشش کو ناکامیاب بنانے کے لیے اسے الٹی ہتھکڑی لگادی۔ وہ کسی زہریلے سانپ کی طرح کامی شاہ کی بانہوں میں مچلنے لگا۔

اس دوران میں زمین بوس شخص اٹھ کر ہمارے قریب آگیا تھا۔ وہ غالباً نادر علی کا باپ اور زینت کا بہنوئی عاشق ترکھان تھا۔ ہم اس وقت گھر کے کشادہ صحن میں تھے۔ گھر کے دیگر افراد بھی ہمارے اردگرد جمع ہوگئے۔

عاشق نے کمزور سی آواز میں پوچھا "آپ کون لوگ ہیں اور یوں دن دہاڑے میرے گھر میں گھس کر میرے بچے کو تشدد کا نشانہ کیوں بنا رہے ہیں؟"

اس کے تمام سوالات احمقانہ اور جاہلانہ تھے۔ میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے نہایت ہی کٹیلے لہجے میں کہا۔

"عاشق علی! لگتا ہے' تم اندھے بھی ہو اور تمہاری مت بھی ماری گئی ہے۔ ہماری وردیاں چیخ چیخ کر یہ اعلان کر رہی ہیں کہ تمہارا تعلق پولیس ڈیپارٹمنٹ سے ہے۔ تمہارے دوسرے بے وقوفانہ سوال کا جواب یہ ہے کہ ہم دن دہاڑے نہیں بلکہ رات پڑے تمہارے گھر میں داخل ہوئے ہیں اور رہ گئی اس کارروائی کی بات تو سن لو" میں نے ایک لمحے کا توقف کیا اور کہا "نہ تو یہ ڈشکرا نادر علی بچہ ہے اور نہ ہی ہم اسے تشدد کا نشانہ بنا رہے ہیں۔ یہ مجرم کو گرفتار کرنے کی سیدھی سی کارروائی ہے۔ کچھ آیا سمجھ شریف میں؟"

اس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں' لکنت زدہ لہجے میں بولا "مم... مجرم.... گرفتاری... نہ' نادر نے کیا جرم کیا ہے؟"

میں نے نادر کی مونچھوں کو کھینچتے ہوئے کہا "یہ تو تم اسی مہینوال سے پوچھو۔"

عاشق علی نے سوالیہ نظر سے بیٹے کو دیکھا' وہ جلدی سے بولا "مم... مم... میں نے کچھ نہیں کیا ابا' یہ تو ایسے ہی..."

اسی وقت کامی شاہ نے نادر کی پنڈلی پر اپنے بوٹ سے ایک زوردار ٹھوکر رسید کی اور خوں خوار لہجے میں غرایا۔ "یہ کیا بکری کی طرح "مم مم میں" لگا رکھی ہے تم نے۔ ہم تمہاری اصلیت معلوم کر چکے ہیں۔"

نادر علی پنڈلی پر لگنے والی چوٹ سے بلبلا اٹھا تھا۔ میں نے اس کے گھنگھریالے بالوں کو مٹھی میں جکڑا اور غصیلے انداز میں کہا۔

"اوئے' کھوتے دے کھر! اگر تم نے کچھ نہیں کیا تو پھر ہمیں دیکھ کر تم بھاگے کیوں تھے؟"

"وہ تو جی...!" بات ادھوری چھوڑ کر اس نے کن انکھیوں سے باپ کو دیکھا پھر بہانہ بناتے ہوئے بولا "وہ جی' مجھے ایک ضروری کام یاد آ گیا تھا۔"

میں نے اس کے گال پر ایک زناٹے دار چماٹ رسید کی اور بپھرے ہوئے لہجے میں کہا "ضروری کام کے بچے! اب تو تمہارے سارے ضروری اور غیر ضروری کام پہلے حوالات میں اور پھر جیل کی سلاخوں کے پیچھے ہی انجام پائیں گے۔"

"آخر نادر نے کیا' کیا ہے؟" عاشق علی نحیف سی آواز میں بولا۔

میں نے اس موقع پر اسے آگاہ کرنا ضروری سمجھا "سنو عاشق علی!" میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا "تمہارے سپوت نے اٹھارہ جون کی رات موضع لالیکا ہی کے ایک گھر میں نقب لگائی ہے' اپنے ایک ساتھی کے ساتھ مل کر جس کا نام صفدر علی تھا اور وہ موضع دولت پور کا رہنے والا تھا۔"

ایک لمحے کو رک کر میں نے اس کے چہرے کے تاثرات کا جائزہ لیا اور بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا "اور یہ بھی کان کھول کر سن لو کہ انہوں نے کس شخص کے گھر میں نقب لگائی تھی" وہ پوری توجہ سے مجھے دیکھنے لگا۔ میں نے سنسناتے ہوئے لہجے میں کہا "اس بدنصیب کا نام ہے کرم دین عرف کرمو چاچا جو اب مرحوم ہو چکا ہے... ہاں وہی کرمو جو تمہارا ہم زلف بھی تھا۔"

اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر تھام لیا اور ڈوبتی ہوئی آواز میں بولا "تو کیا وہ جستی صندوق...؟"

عاشق علی کے نامکمل جملے کو میں نے مکمل کرتے ہوئے کہا "ہاں عاشق علی! وہ جستی ٹرنک انہی دونوں افراد نے کرم دین کے گھر سے چرایا تھا اور ازاں بعد دریا کے کنارے پہنچ کر ان دونوں میں کھٹ پٹ ہو گئی نتیجے میں اس سورما نادر علی نے صفدر کو قتل کر کے ٹرنک میں بند کیا اور خود قیمتی سامان لے کر نو دو گیارہ ہو گیا۔"

"یہ سب کیسے ممکن ہے تھانے دار صاحب" عاشق علی ٹوٹے ہوئے لہجے میں گویا ہوا "وہ تو نادر کی ماسی کا گھر ہے اور ... نگو سے اس کی شادی بھی ہونے والی ہے۔"

میں نے اپنی بات کے اختتام میں نادر کے حوالے سے کچھ کہا تھا وہ مبنی بر قیاس تھا۔ ابھی تک میرے پاس اس کا کوئی ٹھوس ثبوت موجود نہیں تھا لیکن میں نے دیکھا کہ میرے وہ جملے سن کر نادر کے چہرے پر سرسوں کھل گئی تھی جو میری بات کی سچائی پر دلالت کرتی تھی۔ ویسے اس کا' ہمیں دیکھتے ہی بھاگ کھڑے ہونا اسے مشکوک بنانے کے کافی تھا۔

میں نے عاشق علی کی بات کا جواب دیتے ہوئے کہا۔

"عاشق علی! جب کرم دین کے گھر میں چوری ہوئی اس وقت نگو کی شادی نادر سے نہیں بلکہ فضل دین کے بیٹے قادر بخش سے ہونے والی تھی۔ جستی ٹرنک کی چوری نے اس رشتے کو ایک ڈال سے توڑ کر دوسرے ڈال پر پہنچا دیا ہے مگر یہ اب اس ڈال پر بھی نہ ٹھہر سکے گا۔ نگو بے چاری واقعی بہت بد قسمت ثابت ہو رہی ہے۔"

عاشق علی نے کہا "تھانے دار صاحب! آپ کے پاس نادر کے جرائم کا کوئی ثبوت بھی ہے؟"

"بہت سے ثبوت ہیں" میں نے کہا "ہمارے پاس ان دو افراد کا کھرا محفوظ ہے جو کرم دین کے گھر سے جستی ٹرنک چرا کر دریا پر لے گئے تھے۔ ان میں ایک مقتول صفدر علی تھا اور دوسرا نادر" میں نے نادر کا نام پورے وثوق سے لینے کے بعد اس کی آنکھوں میں دیکھا تو اس کے چہرے پر ایک رنگ سا آ کر گزر گیا۔ میں عاشق علی کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے بولا "اب اس طرم خان کا کھرا ابھی چیک کر لیں گے ہم۔ اس کے علاوہ جب چوری کا مال برآمد ہو گا تو دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہو جائے گا۔"

عاشق علی نے حسرت ناک نظر سے بیٹے کو دیکھا۔ میں نے نادر کو کڑے تیوروں سے گھورتے ہوئے پوچھا "کہاں تھے تم اٹھارہ جون کو؟"

"میں تو... ادھر ہی تھا۔" وہ پھنسی پھنسی آواز میں بولا۔

"اوئے ادھر' کدھر اور جدھر کے پتر" میں نے اس کی گردن پر ہاتھ چھوڑتے ہوئے کہا "لگتا ہے' تم آسانی سے زبان نہیں کھولو گے۔ تمہارے ساتھ کوئی دوسرا فارمولا ہی آزمانا پڑے گا۔"

کامی شاہ نے کہا "جب یہ ہمارے تھانے کی حوالات میں

رہے گا تو اس کا انگ انگ بولنے لگے گا ملک صاحب! اس کو ساتھ لے چلیں۔"

"ساتھ تو یہ ضرور جائے گا" میں نے حتمی لہجے میں کہا "اس نے جو کچھ کیا ہے' اس کا حساب کتاب ہوگا۔"

پھر میں نادر کے باپ عاشق علی کی جانب مڑ گیا "عاشق علی! تم بتاؤ' تمہارا یہ لاڈلا اٹھارہ جون کو کہاں تھا" پھر میں نے وضاحت کی "اس تاریخ کو کرم دین کے گھر میں چوری ہوئی تھی۔"

"جناب' میں جون جولائی کا حساب تو جانتا نہیں" وہ الجھن زدہ لہجے میں بولا۔

میں نے کہا "تمہیں وہ دن تو یاد ہوگا جب تمہاری سالی زینت بی بی کے گھر میں چوری ہوئی تھی۔ یہ زیادہ پرانی بات نہیں ہے۔ اس روز نادر کہاں تھا؟ میں یہی پوچھ رہا ہوں۔"

وہ کچھ سوچتے ہوئے بولا "ہاں' یاد آیا۔ یہ اس دن گھر میں نہیں تھا۔"

"پھر کہاں تھا؟"

"مجھے تو نہیں معلوم تھا" وہ بولا "جب یہ رات کو گھر واپس نہیں آیا تو میں نے اس کی ماں سے پوچھا۔ فضیلت نے بتایا کہ وہ ایک دن کے لیے فورٹ میرٹ گیا ہوا ہے' کسی دوست سے ملنے۔"

میں نے غصیلی نظر سے نادر کو گھورا اور کہا "اوئے بدبخت! تم تو کہہ رہے تھے کہ اٹھارہ جون کو ادھر ہی تھے۔ یہ تمہارا "ادھر" فورٹ میرٹ میں ہوتا ہے یا دولت پور میں؟"

نادر کو یقین ہو چلا تھا کہ وہ بری طرح پھنس چکا تھا۔ اسے خیالی یا عملی فرار کی کوئی راہ نظر نہ آئی تو خاموش رہنے پر اکتفا کیا۔ میرے سوال کا جواب دینے کی بجائے زمین کو گھورنے لگا۔

میں نے وقت ضائع کرنے کے بجائے "کارروائی" کو اہمیت دی اور ایک دو معزز پڑوسیوں کو بھی عاشق کے گھر میں بلا لیا پھر نادر سے سوال کیا "کہاں چھپایا ہے تم نے چوری کا وہ مال؟"

وہ بدستور خاموشی سے زمین کو گھورتا رہا۔

میں نے کامی شاہ کو اشارہ کیا اور خود بھی اس کے ساتھ مصروف ہوگیا۔ کانسٹیبل اسماعیل بھی ہمارے ساتھ بھرپور تعاون کر رہا تھا۔ ہم نے محلے والوں کی موجودگی میں آدھے گھنٹے کی محنت کے بعد مال مسروقہ برآمد کرلیا۔

جستی ٹرنک کا قیمتی سامان ایک گٹھری کی صورت اناج والے پڑولے (مٹی اور بھوسے سے تیار کردہ ایک قد آدم برتن جو اناج وغیرہ کے ذخیرے کے کام آتا ہے) میں چھپایا گیا تھا۔ میں تلاشی کے دوران میں نادر پر کڑی نظر رکھے ہوئے تھا۔ اس کی ہتھکڑی بھی میرے ہاتھ میں تھی۔ جب ہم مذکورہ پڑولے کے آس پاس تلاشی لے رہے تھے تو نادر کی ایک اضطراری حرکت نے مجھے چوکنا کردیا اور میں پڑولے کی مکمل تلاشی لیے بغیر نہ رہ سکا جس کے نتیجے میں کامیابی میرے ہاتھ آئی تھی۔

جب ہم اندر ایک کمرے میں اس کارروائی میں مصروف تھے تو اسی وقت نادر کی ماں فضیلت گھر میں داخل ہوئی۔ اس نے سر پر روٹیوں والی ایک بڑی سی چنگیر (ڈلیا) اٹھا رکھی تھی۔ تھوڑی دیر پہلے میرے ایک سوال کے جواب میں عاشق علی نے بتایا تھا کہ فضیلت روٹی لگوانے تنور پر گئی ہوئی تھی۔

گھر کے اندر والی صورتِ حال دیکھ کر فضیلت ہتھے سے اکھڑ گئی۔ یہ بات سمجھنے میں اسے ذرا سی بھی دقت پیش نہیں آئی تھی کہ ہم نے نہ صرف مال مسروقہ برآمد کرلیا تھا بلکہ اس کے لخت جگر کو بھی گرفتار کرکے اپنے ساتھ لے جانے کا ارادہ رکھتے تھے۔ نادر کی حالت کسی مردے ایسی ہو رہی تھی۔ فضیلت جس حد تک شور مچا سکتی تھی' اس نے ضرور

کوشش کی مگر میں نے اس کی چیخ وپکار کو ایک کان سے سن کر دوسرے کان سے نکال دیا اور موقع کی ضروری قانونی کارروائی نمٹانے کے بعد واپسی کا سفر اختیار کیا۔ اس مرتبہ تانگے میں مال مسروقہ والی گٹھری اور زیر حراست نادر علی کا اضافہ ہوچکا تھا۔

وہ رات ہم نے متعلقہ تھانے میں گزاری کیونکہ اس وقت لالیکا واپس آنا ممکن نہیں تھا۔ دوسری صبح ہم اپنے تھانے کے لیے ہارون آباد سے لالیکا کے لیے چل پڑے اور دوپہر سے پہلے ہم اپنی منزل پر پہنچ چکے تھے۔

اسی روز میں نے کھوجی بابا دین محمد کو بلا کر نادر کے کھرے کی تصدیق کرلی۔ کرم دین کے گھر میں چوری کرنے والے دو افراد میں سے ایک نادر علی ہی تھا۔ اب سب کچھ روز روشن کی طرح عیاں ہوچکا تھا۔ ہماری تھوڑی سی "عملی کوشش" کے بعد نادر علی نے زبان کھول دی۔ پھر اس کی کھلی زبان نے بڑے عبرت انگیز اور شرم ناک انکشافات کیے۔

نادر علی نے نہ صرف چوری بلکہ صفدر کے قتل کا بھی اقبال کرلیا تھا۔ واقعات کے مطابق اس فتنے کی سرغنہ فتنہ ساماں فضیلت تھی۔ جب اس کی ہر کوشش ناکامیاب ہوگئی تو اس نے نگو کا رشتہ حاصل کرنے کے لیے ایک بھیانک اور تباہ کن منصوبہ بنایا۔ اس منصوبے سے صرف فضیلت اور نادر ہی واقف تھے۔ نگو کا رشتہ فضیلت کی انا کا مسئلہ بن گیا تھا۔ اس نے فیصلہ کیا کہ اگر نگو نادر کو نہ ملی تو پھر قادر بخش کو بھی نہیں ملے گی۔ اس نے اپنے عزائم سے زینت کو بھی بے خبر رکھا تھا۔

فضیلت، قادر کے باپ فضل دین کی لالچی فطرت سے واقف تھی اور وہ یہ بھی جانتی تھی کہ اس نے پندرہ تولے سونے کے زیورات کی شرط عائد کر رکھی ہے۔ اس نے اپنے بیٹے کو اعتماد میں لیا اور نگو کے جہیز کا سامان چوری کروانے کا منصوبہ بنایا۔ اس سلسلے میں عاشق علی کو مکمل اندھیرے اور بے خبری میں رکھا گیا تھا۔

فضیلت بہت چالاک اور چالباز عورت تھی۔ وہ جب بھی لالیکا جاتی، زینت کے گھر کے تالوں پر کوئی نہ کوئی تبصرہ ضرور کرتی۔ ساتھ ہی یہ مشورہ بھی دیتی کہ کوٹ حضور سنگھ میں ایک لوہار بہت مضبوط تالے بناتا ہے۔ تم اگر کہو تو میں تمہیں بھی چند تالے لادوں۔ ایک روز زینت نے اس کا مشورہ صائب جانتے ہوئے تین تالوں کی فرمائش کردی۔ دو تالے کمروں کے لیے اور ایک گھر کے داخلی دروازے کے لیے۔ وہ بہن کی بدنیتی سے ناواقف تھی۔

فضیلت کے دل کی مراد بر آئی۔ اس نے مذکورہ لوہار سے تین عدد تالے تیار کروائے۔ چالاکی اس نے یہ کی کہ تالوں کی ایک ایک چابی زائد بنالی۔ پھر جب اس کے دیئے ہوئے تالے کرم دین کے گھر میں استعمال ہونے لگے تو اس نے نادر کے ذریعے نگو کو جہیز کا سامان چوری کروانے کے منصوبے پر عمل کرڈالا۔ تالوں کی زائد چابیاں اس نے نادر کے حوالے کیں۔ وہ جانتی تھی کہ ان دنوں وہ تینوں اپنے گھر کی چھت پر سوتے تھے۔ اس صورت میں نادر کا کام خاصا آسان ہوجاتا۔ اپنی بہن سے باتوں کے دوران میں وہ نہایت ہوشیاری سے یہ بات معلوم کرچکی تھی کہ سارا قیمتی سامان ایک جستی ٹرنک میں رکھا گیا تھا۔

منصوبے کو بہ طریق احسن پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے لیے نادر کو ایک مددگار کی ضرورت تھی صفدر سے زیادہ اسے کوئی موزوں نظر نہ آیا۔ صفدر سے اس کی دوستی خاصی پرانی تھی۔ اس نے صفدر کو پوری بات بتائے بغیر اپنی مدد کے لیے تیار کرلیا لیکن جب دریا کے کنارے پر پہنچ کر جستی ٹرنک کو چھوڑنے کا مرحلہ آیا تو نادر کی غلط بیانی صفدر سے پوشیدہ نہ رہ سکی۔ نادر نے اسے قیمتی سامان کے بارے میں نہیں بتایا تھا۔ صفدر نے اس دھوکا دہی پر احتجاج کیا اور ساتھ ہی آدھے مال مسروقہ کا مطالبہ کردیا۔ نادر علی اس مال سے ایک سوئی بھی دینے کو تیار نہیں تھا۔

پھر دونوں میں تلخ کلامی ہونے لگی جو ہاتھا پائی میں بدل گئی۔ بالآخر نادر نے اپنے لباس میں پوشیدہ خنجر نکال کر صفدر کے سینے میں گھونپ دیا اور اسے ٹرنک میں بند کرنے کے بعد قیمتی مال مسروقہ گٹھری میں باندھ کر وہاں سے چلتا بنا۔ اس کے بعد جو حالات پیش آئے وہ شروع میں بیان کیے جاچکے ہیں۔

نادر علی اپنے تمام جرائم کا اقبال کرچکا تھا للٰذا اس کیس میں اب مزید کوئی بکھیڑا باقی نہیں رہا تھا۔ میں نے مجرم کے اقبالی بیان کے ساتھ اپنی تفصیلی رپورٹ تیار کرکے اسے حوالہ عدالت کردیا۔ میرا کام یہیں تک تھا۔

کہتے ہیں، ہر کامیاب مرد کے پیچھے کسی عورت کا ہاتھ ہوتا ہے... اور یہ بھی سننے میں آتا ہے کہ ہر برباد عورت کے پیچھے کسی مرد کا ہاتھ ہوتا ہے۔ اس سلسلے میں میرا تجربہ خاصا مختلف ہے۔ میں نے یہ دیکھا ہے کہ دنیا میں اچھے برے ہر قسم کے انسان پائے جاتے ہیں۔ انسان کی ترقی یا تنزلی اور بناؤ یا بگاڑ میں خود اس کا اپنا غالب ہاتھ ہوتا ہے۔ اس میں مرد و زن کی کوئی تخصیص یا تفریق نہیں۔ آپ کا کیا خیال ہے؟

(تحریر: حسام بٹ)